فروری 2015، قیمت 10 ₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

21 فروری 2015

یومِ مادری زبان

Mother Language Day

21 Feb 2015

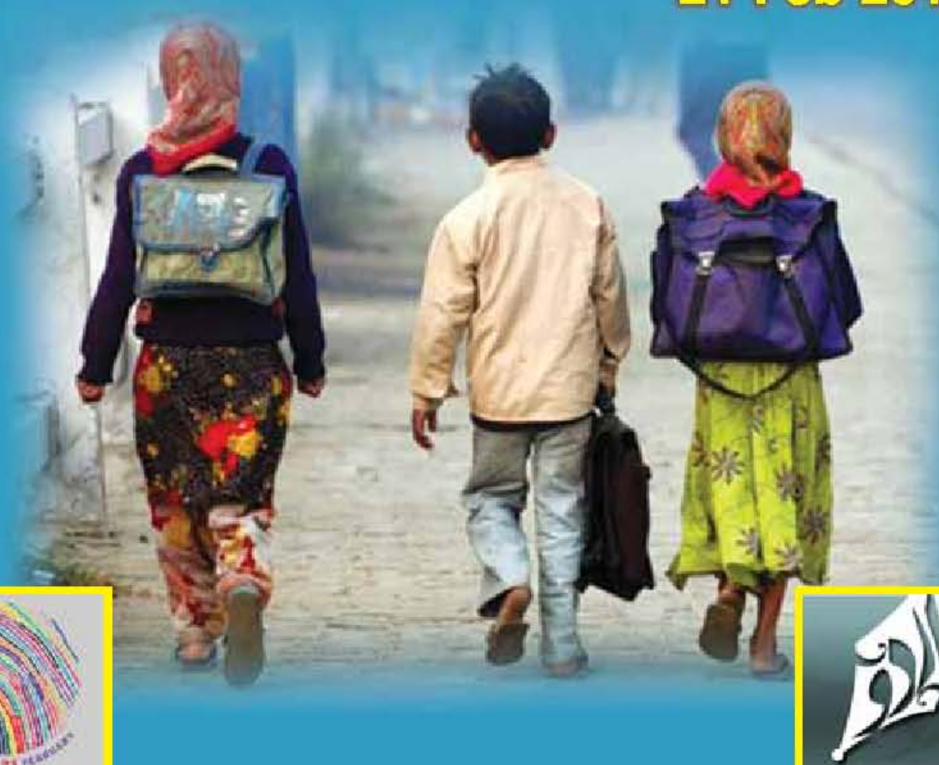

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد:3 شمارہ:2 فروری 2015

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	4
نظم	امّی یہ کیا کہتی ہو؟	اسنیٰ بدر	5
کہانیاں	پہلی اڑان	سید محمد اشرف	6
	توبہ	مشتاق اعظمی	11
	سچ گھڑنے والا	ایم یوسف انصاری	13
	چور لڑکا	محمد قیوم میو	16
	نیولا	ترجمہ: فردوس بانو	18
تاریخ کے صفحوں سے	شاہ جہاں زندہ باد	راشد جمال فاروقی	20
نظمیں	نیا سال	ایم آئی ساجد، سہیل عالم	22
سائنس کی الف لیلہ	پادری اور بارود	مترجم: انیس الدین ملک	23
نانی کا صندوق	گیت	ساحر لدھیانوی	28
	بھلا بتایئے تو...	کنہیا لال کپور	29
کامکس	بھولے بھالو کی حماقتیں	ادارہ	33
اک تھا بچپن	میں نے کیسے پڑھنا سیکھا	مقصود الٰہی شیخ	39
قسط وار ناول	رابنسن کروسو-3	ڈینئل ڈیفو	41
غزل	غزل	حشمت کمال پاشا	51
نظم	سردی کے دو روپ	مہدی پرتاپ گڈھی	51
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	52
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ	ادارہ	56
بچوں کا اخبار	بچوں کی خبریں	ادارہ	57
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	59
اردو فیس بک	بچوں کی باتیں	ادارہ	61
انٹرنیٹ سے	انوکھے منظر	ادارہ	62

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبۂ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya @ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،
نئی دہلی-110066
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com
'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں
شاخ 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ گٹی، حیدر آباد 500002
فون: 040 - 24415194

آپس کی باتیں

دوستو یہ مہینہ ہماری مادری زبان کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ فروری کی 21 تاریخ کو دنیا بھر میں 'یوم مادری زبان' یعنی Mother Language Day منایا جاتا ہے۔ ہماری حکومت اس سلسلے میں خاص دل چسپی لے رہی ہے اور اس نے پورے ملک میں اس دن خاص اہتمام کے ساتھ 'یومِ مادری زبان' منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے مرکز بھی اس میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ مگر پہلے چند باتیں اس دن کی اہمیت کے بارے میں۔

آپ نے اقوام متحدہ یا یونائٹڈ نیشنز United Nations کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ یہ دنیا بھر کے ملکوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے جسے یو این UN کے چھوٹے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ تنظیم دنیا میں امن و سکون قائم رکھنے، آپس کے جھگڑے نمٹانے اور ساری دنیا کو ایک بہتر دنیا بنانے کے مقصد سے قائم کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ عظیم الشان ادارہ اپنے تمام مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکا اور نہ ہی ملکوں کی آپس کی جنگوں کو پوری طرح روک پایا، لیکن انسانی نسل کی بھلائی کے کئی کام اس نے کیے ہیں جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور ضرورت تمام تر ناکامیوں کے باوجود آج بھی اتنی ہی ہے جتنی 70 برس پہلے اس وقت تھی جب یہ ادارہ قائم ہوا تھا۔ اقوام متحدہ کے خود اپنے کئی اہم ادارے ہیں جن کی مدد سے وہ پوری دنیا میں اچھے اچھے کام کرتی ہے۔ ان ہی میں ایک ادارہ ہے یونیسکو UNESCO! یہ دراصل United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization کا مخفف یعنی چھوٹا نام ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ادارہ پوری دنیا میں تعلیم، سائنس اور تہذیب و ثقافت کی ترقی کے لیے کام کرتا ہے۔ اسی ادارے نے 17 نومبر 1999 کو طے کیا تھا کہ 21 فروری کا دن پوری دنیا میں مادری زبان کے دن کے طور پر منایا جائے۔ لیکن 21 فروری کو ہی کیوں؟ اس کی بھی ایک تاریخ ہے۔ 21 فروری 1952 وہ دن تھا جب مشرقی بنگال کے شہر ڈھاکہ میں، جو کہ اس وقت کے مشرقی پاکستان کی راجدھانی تھا اور آج ایک الگ ملک بنگلہ دیش کی راجدھانی ہے، بنگالی طالب علموں نے اپنی مادری زبان 'بنگالی' کو پاکستان کی دو میں سے ایک قومی زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ پولیس نے ان لوگوں پر گولیاں چلائیں جن سے کئی طالب علم اپنی مادری زبان کی حفاظت کے لیے شہید ہوگئے۔

بچو مادری زبان اسے کہتے ہیں جو ہمیں ہماری ماں سے ملتی ہے۔ وہ جس زبان میں ہمیں بولنا اور اپنی بات کہنا سکھاتی ہے وہی ہماری مادری زبان بن جاتی ہے۔ جیسے ان شہید طالب علموں کی مادری زبان 'بنگالی' تھی یا جیسے ہماری آپ کی مادری زبان اردو ہے۔ اِس طرح پوری دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کچھ کم اور کچھ زیادہ۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ ہماری مادری زبان اردو، دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں شامل ہے۔ زبانیں دراصل خوشبو دینے والے حسین پھولوں کی طرح ہوتی ہیں جن سے ہماری روزمرہ زندگی میں ایک قرینہ اور سلیقہ تو پیدا ہوتا ہی ہے ہمارے کلچر میں بھی خوب صورتی آتی ہے۔ 'یومِ مادری زبان' منانے کا اصل مقصد دنیا بھر میں کلچر کی اِس رنگارنگی کو قائم رکھنا ہے کیونکہ یہ رنگارنگی ہی دنیا کو خوب صورت بناتی ہے۔ ذرا سوچو، اگر دنیا میں سب کچھ ایک ہی رنگ، ایک ہی شکل اور ایک ہی صورت کا ہوا کرتا تو دنیا کیسی بے رنگ اور زندگی کتنی بے مزہ ہو جاتی۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ جو زبان بھی ہمیں اپنی ماں سے ملی ہے، اس سے ہم ماں کی ہی طرح محبت کریں، اسے پوری طرح اپنائیں اور دوسروں کو بھی لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھائیں۔

ایک بات اور۔ 'بچوں کی دنیا' کا جنوری 2015 کا شمارہ دسمبر 2014 کے دوسرے ہفتے میں چھپ کر آیا ہی تھا کہ 16 دسمبر کو پڑوسی ملک سے وہ خبر آئی جس نے پوری دنیا کو دہلا دیا۔ پاکستان کے شہر پشاور میں پاکستانی طالبان دہشت گردوں نے ایک اسکول پر حملہ کر کے 145 لوگوں کو قتل کر دیا جن میں 132 اسکولی بچے تھے۔ جس نے سنا اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ ماؤں نے کلیجے تھام لیے۔ اگلے دن ہماری پارلیمنٹ میں سب ممبروں نے اپنا غم ظاہر کیا۔ ہندوستان کے سبھی اسکولوں میں بچوں نے معصوم شہیدوں کے غم میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کی۔ لیکن افسوس، جن لوگوں نے یہ حرکت کی وہ اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئے اور مذہب کے نام پر اس ظلم کو آج بھی درست ٹھہرا رہے ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' شہید بچوں کے والدین اور دوستوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ آپ بھی دعا کیجیے کہ خدا انھیں صبر عطا کرے۔ آمین

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

اسنیٰ بدر

ایک نظم پشاور اسکول کے بچّوں کی یاد میں

امّی یہ کیا کہتی ہو؟

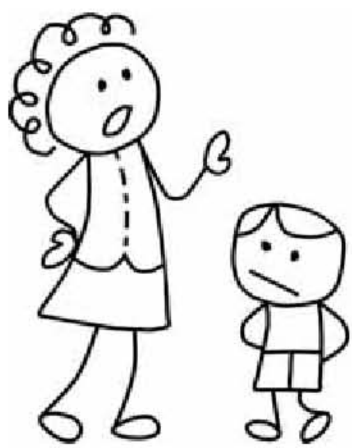

متھرا میں ہندوستانی اسکول کے بچّے ، پاکستانی شہر پشاور میں طالبان دہشت گردوں کی وحشیانہ فائرنگ سے شہید ہونے والے اسکولی بچّوں کو یاد کرتے ہوئے، اوپر پاکستانی شہری بچّوں کی یاد میں شمعیں جلاتے ہوئے

امّی تم تو اک دن کے ناغے پر غصّہ ہو جاتی تھیں !
کہتی ہو اسکول نہ جانا؟
امّی کچھ تو یاد کرو ،سب بھول گئی ہو
کل پیپر ہے بھول نہ جانا
امّی میرے دوست کو جب وہ انکل گولی مار رہے تھے
میرے آنسو خوب بہے تھے
امّی انہوں نے پیشانی پر اور سینے پر گولی ماری
ختم ہوئے سب باری باری
امّی میں اک میز کے نیچے چھپ کر بیٹھا دیکھ رہا تھا
کیسا کیسا درد سہا تھا
امّی میری مس کہتی تھیں بچوں پر یہ ظلم نہ توڑو
وحشی لوگو ان کو چھوڑو
امّی میری مس کو انکل نے جھلسایا تھا شعلوں میں
آگ بھری اونچی لپٹوں میں
امّی میں نے خود دیکھے ہیں چار طرف سارے آزردہ
الٹے سیدھے زندہ مردہ
امّی میرے چھوٹے دل کی دھڑکن دیکھو بڑھی ہوئی ہے
میری کتنی جان بچی ہے
امّی اگر اسکول نہ پہنچا سب سے پیچھے رہ جاؤں گا
دیکھو اب مت روکو مجھ کو
پیاری امّی ،اچھی امّی ،شاید یہ اک خواب ہو میرا
اور وہاں سب ویسا ہی ہو

Asna Badr
Riyadh, Saudi Arabiya

سید محمد اشرف

پہلی اڑان

نویں جماعت میں داخل ہوتے ہی عابد کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اسکول کی یونیفارم لازمی ہوگئی۔ کلاس میں بنچ کے بجائے کرسی ملی جس پر بیٹھ کر اس نے خود کو کئی زاویوں سے محسوس کیا۔ ڈیسک کی حالت بھی بہتر تھی۔

لیکن گھر میں ابھی بھی بہت سی پابندیاں تھیں۔

شام کو ہاکی کھیلنے نکلتا تو چچا دروازے میں ہی مل جاتے اور ٹوکتے

''ہاکی کھیلنے تو جا رہے ہو اب گٹے تڑوا کر مت آنا۔''

مغرب کی نماز کے بعد ہی ابو کی آواز ابھرتی۔ ''لائٹ نہیں آئی تو کیا بڑی لال ٹین جلا کر دن بھر کی پڑھائی روائز کرو۔ آج کا ہوم ورک ملا؟''

''جی'' وہ مری مری آواز میں جواب دیتا۔

امّاں ویسے تو بہت مہربان تھیں لیکن برادے کی انگیٹھیاں بھروانے میں کوئی رعایت نہیں کرتی تھیں چاہے اس کام میں اتنا وقت لگ جائے کہ ہاکی کی فیلڈ تک پہنچتے پہنچتے کھیل کا ٹائم ختم ہو چکا ہو۔

بس اتوار مزے کے سندیسے لے کر آتا۔ سنیچر کی شام سے ہی اسے فضا میں ہلکی ہلکی گھنٹیوں اور سریلے نغموں کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ اتوار کے دن وہ ناشتہ کر کے آنگن میں پلنگ پر لیٹ جاتا اور دیر تک دور دور تک پھیلے نیلے آسمان کو دیکھتا رہتا۔ آسمان میں اوپر بہت اوپر پرندے آہستہ آہستہ پروں کو حرکت دیے بنا اڑتے نظر آتے۔

سید محمد اشرف کو جانتے ہیں آپ؟ چلیے ہم ملوائے دیتے ہیں۔ اشرف صاحب اردو کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آج اردو میں سب سے اچھے ناول اور افسانے لکھنے والے جو تین چار ادیب ہیں ان میں ایک اشرف صاحب ہیں۔ ادب کا بہت بڑا اعزاز ساہتیہ اکادمی ایوارڈ انھیں مل چکا ہے۔ کم لکھتے ہیں زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ مگر ان کی تخلیقات بڑوں کے لیے ہوتی ہیں۔ 'نمبردار کا نیلا'، 'میر اَمّن قصہ سنو' اور 'مردار خور' ان کے مشہور ناول ہیں۔ بچّوں کے لیے انھوں نے تیس پینتیس برس پہلے چند کہانیاں اور نظمیں لکھی تھیں۔ یہ 'بچوں کی دنیا' اور آپ سب کی خوش قسمتی ہے کہ اتنے طویل عرصے بعد انھوں نے ہمارے لیے ایک بڑی ہی پیاری کہانی لکھی ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ رتن سنگھ، عبدالصمد، حسین الحق، مظفر حنفی، سلام بن رزاق، عبدالاحد ساز جیسے اردو کے مایہ ناز ادیبوں کے ساتھ سید محمد اشرف بھی 'بچوں کی دنیا' کے لکھنے والوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ **اعزازی مدیر**

"یہ کتنے اونچے ہیں اور کتنے آزاد!"

وہ اپنے آپ سے کہتا۔ اور جب یہ کہتا تو پھیلے ہوئے آسمان کے کسی کونے سے اداسی کی ایک لہر اس کے من میں اتر آتی۔ کیا میں ان سے اونچا جا سکتا ہوں۔ اور آزادی کے ساتھ بنا کسی روک ٹوک کے بغیر ہاتھ ہلائے خاموشی سے اتنی بلندی پر اڑ سکتا ہوں۔

ماہوٹ کا زمانہ تھا اور آسمان پر کہیں کہیں بادل بھی تھے۔ اسے بڑا تعجب ہوا جب اس نے دیکھا کہ کچھ پرندے بادلوں سے بھی اوپر اڑ رہے ہیں۔ بادل اپنی جگہ سے ہٹتے تو ان کے اوپر اڑتے ہوئے پرندے نظر آنے لگتے۔

"عابد بیٹا! اٹھو۔ بازار سے آلو، گوبھی اور سیم کی پھلی لے آؤ۔"

وہ لیٹے لیٹے اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔

"اونھ" اس کے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا اونھ؟ سودا نہیں لاؤ گے؟"

"امی! ابھی میں پرندے دیکھ رہا ہوں۔ دیکھو کتنے اونچے اڑ رہے ہیں۔"

امی نے باورچی خانے سے باہر نکل کر آسمان پر ایک نگاہ پھینکی اور وہ بھی دیر تک ادھر دیکھتی رہیں۔ پھر وہ بھی اپنی روزمرہ کی دنیا میں واپس آ گئیں۔

"ان پرندوں کو دیکھ کر کیا ہوگا۔ ترکاری لانے میں دیر کی تو اتنی دیر میں اچھی ترکاریاں بک چکی ہوں گی۔ گلی گلائی ترکاریاں پکڑا دے گا ترکاری والا۔"

"امی! کیا میں ان پرندوں سے اونچا اڑ سکتا ہوں؟" اس نے نظر بچا کر دیکھ لیا تھا کہ ابا اور چچا صاحب آس پاس نہیں تھے۔

"وقت پر اسکول جاؤ اور ہوم ورک پورا کر لیا کرو تو ان پرندوں سے بھی اونچے اڑ سکتے ہو۔"

اسے ہنسی آ گئی۔ "روزانہ وقت پر اسکول جاتا ہوں۔ ہوم ورک دن کے دن پورا کر لیتا ہوں۔ ان پرندوں کے برابر تو ایک طرف، کبھی اتنا بھی اونچا نہیں اڑ پایا"۔

دن یوں ہی گزرتے گئے۔ پرندوں سے اونچا اڑنے کی خواہش روز بہ روز تیز ہوتی گئی۔ رات کو سوتے وقت وہ ہمیشہ مایوس اور اداس ہوتا تھا۔ نیند بھی گہری نہیں ہوتی تھی۔ خواب میں اکثر دیکھتا کہ اس نے بڑے بڑے پردوں کے پر بنا کر اپنے بازوؤں میں باندھ لیے ہیں اور چھت سے چھلانگ لگا کر آسمان کی طرف اڑ گیا ہے اور دھیرے دھیرے پرندوں سے اوپر... بہت اوپر جاکر پرواز کر رہا ہے

"جلدی جاؤ۔ بحث میں وقت مت خراب کرو۔" امی کا جواب مختصر تھا۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھا اور جھولا لے کر بازار روانہ ہو گیا۔ دن یوں ہی گزرتے گئے۔ پرندوں سے اونچا اڑنے کی خواہش روز بہ روز تیز ہوتی گئی۔ رات کو سوتے وقت وہ ہمیشہ مایوس اور اداس ہوتا تھا۔ نیند بھی گہری نہیں ہوتی تھی۔ خواب میں اکثر دیکھتا کہ اس نے بڑے بڑے پردوں کے پر

بنا کر اپنے بازوؤں میں باندھ لیے ہیں اور چھت سے چھلانگ لگا کر آسمان کی طرف اڑ گیا ہے اور دھیرے دھیرے پرندوں سے اوپر... بہت اوپر جا کر پرواز کر رہا ہے۔ نیچے دیکھنے پر اسے پہلے پرندے نظر آتے، پھر اپنا گھر نظر آتا جہاں آنگن میں کھڑے ہو کر ابا اور امی ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے تھے۔ چچا آنکھ پر دوربین لگائے اس کی طرف دیکھتے نظر آتے۔ پھر چچا صاحب ہاتھ کے اشارے سے اسے اترنے کو کہتے اور بس تبھی اس کی آنکھ کھل جاتی۔ حلق خشک ہوتا اور وہ پانی پینے گھڑونچی کی طرف بڑھتا تو ابا کھنکار کر کہتے۔ ”رات بھر جاگتے رہتے ہو۔ دن میں اتنا کھیلتے ہو کہ تھکن کی وجہ سے نیند نہیں آتی ہوگی۔ ذرا ان باتوں کا خیال رکھو۔“

وہ اندر ہی اندر مسکراتا لیکن پھر اداس ہو جاتا۔ بھلا خواب میں اڑنا کوئی سچ مچ اڑنا تھوڑے ہی ہوتا ہے۔

اب سردیاں بڑھ گئی تھیں۔ دن رات کہرا چھایا رہتا۔ بس بارہ ایک بجے کے قریب مدھم مدھم روشنی والا سورج نظر آپاتا۔ ہاکی کا کھیل بھی موسم کی نذر ہو گیا تھا۔

ایک دن عشا کی نماز کے بعد امی نے کہا۔

”بوا کہہ رہی ہیں وہ ناس پیٹی کالی بلی دودھ کے برتن میں منھ ڈال گئی۔ صبح تمہارے ابا کو مقدمے کے کام سے ضلع کی عدالت میں جانا ہے۔ جاؤ بیٹا دودھ لے آؤ۔ دوکانیں بند ہونے والی ہیں۔ اف... اس بار کتنا جاڑا پڑے گا۔ مفلر لپیٹ کر جانا۔ لو میری شال بھی اوڑھ لو۔“

وہ جب دودھ کا برتن لے کر گھر سے نکلا تو دروازے کے باہر کہرے کی موٹی پرت نے اس کا راستہ روکا۔ باہر سناٹا تھا اور سخت سردی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا بازار کی طرف بڑھا۔ حلوائی دوکان بڑھا چکا تھا اور بازار خالی ہو چکا تھا۔

”ارے عابد میاں۔ اتنی رات کو کیسے نکل آئے۔“

”دودھ ہے؟ ہمارا دودھ ناس پیٹی کالی بلی پی گئی۔“

”ایں- یہ ناس پیٹی کا لفظ تو عورتیں بولتی ہیں“۔ رحمت حلوائی کانپ کانپ کر ہنس رہا تھا اور ہنس ہنس کر کانپ رہا تھا۔

”رحمت چچا! جلدی سے دودھ دے دو۔ گھر کی بوا نے ہی بلی کے بارے میں یہ کہا تھا... میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔“

دودھ لے کر جب وہ واپس آ رہا تھا تو مسجد کے موڑ پر اسے کہرے میں لپٹی ہوئی ایک چڑیل نظر آئی جس کے دونوں ہاتھوں کی انگلی پکڑے ہوئے اس کے دائیں بائیں دو بالشتیے چل رہے تھے۔ کہرے نے ان کے پاؤں ڈھک رکھے تھے ورنہ وہ چڑیل کے پیچھے مڑے ہوئے پیروں کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ شال اور مفلر کے باوجود اسے پسینہ آ گیا۔ اسے یاد آیا ابا نے کہا تھا کسی بھی قسم کا خوف ہو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں آیت الکرسی شروع کی۔ ابھی وہ آدھی بھی نہیں پڑھ پایا تھا کہ اسے چڑیل اور بالشتیوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اس کے بالکل قریب آ چکے تھے۔

بادل سرکے اور چاند نے اپنا دھندلا سا چہرا دکھایا تو اس کو روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ چڑیل اور بالشتیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں۔

آیت الکرسی کا اثر ہو رہا ہے۔ اس نے سوچا۔

وہ وہیں مضبوطی سے کھڑا رہا۔ لیکن یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ دودھ کا برتن اس کے ہاتھ میں کانپ رہا ہے۔ اب وہ ان کی شکلیں غور سے دیکھ چکا تھا۔ ارے... یہ تو دو ننھے بچے اور ان کی ماں ہیں۔

عورت نے معمولی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کا بلاؤز پوری آستین کا تھا جس پر ایک پرانا سوئٹر پہنے تھی۔ عابد نے ڈرتے ڈرتے اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔ وہ عام عورتوں کی طرح تھے۔ وہ سستے قسم کی چپلیں پہنے ہوئے تھی اور سردی سے بچنے کے لیے بار بار اپنے پیروں کی انگلیوں کو حرکت دے رہی تھی۔ روتے ہوئے بچوں نے بھی سستے کپڑے اور پرانے سوئٹر پہنے تھے جن میں جھونترے نکل آئے تھے۔ عابد نے اپنے موزوں کو دیکھ کر سوچا کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی موزے نہیں پہنے ہوئے ہے۔ ان کو کتنی ٹھنڈ لگ رہی ہوگی۔ اس خیال سے اسے اور زیادہ سردی لگنے لگی۔

''بھیا!'' عورت اس سے مخاطب ہوئی۔ ''سب دوکانیں بند ہوگئی ہیں۔ میرے بچے بہت بھوکے ہیں، کب سے رو رہے ہیں۔''

''آپ کے گھر میں کھانا نہیں پکا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا گھر ریل کے اگلے اسٹیشن پر ہے۔ یہاں کا اسٹیشن اور ہمارا اسٹیشن اندھیرے میں ایک سے لگتے ہیں۔ گاڑی یہاں کے اسٹیشن پر رکی تو مسافروں نے کہا تمہارا اسٹیشن آ گیا۔ جلدی سے اتر جاؤ۔ میں بچوں کو لے کر جلدی سے اتر آئی۔ میری بکسیا بھی ریل میں رہ گئی۔ اس میں تھوڑے پیسے بھی تھے''۔ وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر بچے اور زور زور سے رونے لگے۔

''میرا اسٹیشن یہاں سے پانچ میل دور ہے اور وہاں سے میرا گھر ایک کوس ہے۔ لیکن اس اندھیارے میں ان بھوکے بچوں کو لے کر کیسے جاؤں۔'' عابد نے صاف صاف دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے ہیں۔

عابد نے ایک لمحے میں اندازہ کر لیا کہ اب اس عورت کے پاس بھوکے رہنے اور رات بھر سڑک پر ٹھنڈ کھانے کے علاوہ کوئی اور چارا نہیں ہے۔

''میرے گھر چلیے۔'' اس نے بائیں ہاتھ سے بڑے بچے کا ہاتھ پکڑا اور مضبوط قدم رکھتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا۔

ابا... اماں... چچا صاحب... دیکھا جائے گا۔

گھر کے باہر والے کمرے کے دروازے میں ہاتھ ڈال کر کنڈی گرائی اور گرم کمرے میں داخل ہو کر تینوں کو اندر بلا کر پلنگ پر بٹھا دیا۔

گھر میں داخل ہوا تو اماں سردی اور کہرے کے باوجود آنگن میں ٹہل رہی تھیں۔ ''کہاں رہ گئے تھے؟ کیا سو گئے تھے؟ میں کتنی دیر سے ہول رہی تھی۔''

وہ اماں کے سوالوں کے جواب میں خاموش رہا۔ پھر اس نے رک رک کر سنبھل سنبھل کر پوری بات بتائی۔ اماں کا چہرا فق ہو گیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے معمول پر آئیں۔

''کیا۔ اس کے ساتھ بہت چھوٹے بچے ہیں؟''

''ہاں۔ دو بچے ہیں۔ دونوں بھوکے اور سردی میں کانپتے ہوئے۔''

اماں نے دودھ باورچی خانے میں رکھا۔ اور اندر والے دالان میں جا کر ابا سے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اماں ابا اور چچا صاحب ایک لحاف، ایک گدا اور ایک کشتی میں دال، روٹی اور سبزی لے کر باہر کے کمرے میں جانے لگے۔

''اماں''! اس نے ماں کا دامن پکڑ لیا۔

''بچوں کے لیے دودھ بھی لے جاؤ۔''

اماں نے ایک دفعہ اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور کہا:

''تم گرم کر کے باہر والے کمرے میں لے آؤ۔ دو پیالے بھی لے آنا اور شکر بھی۔''

جب وہ دودھ لے کر باہر والے کمرے میں پہنچا تو ابا اور چچا صاحب گھر کے اندر آ چکے تھے۔ بچے لحاف میں دبکے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور اماں اس عورت سے اس طرح باتیں کر رہی تھیں جیسے اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ عورت سر جھکائے اماں کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

صبح عابد کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اس نے رات کی باتیں یاد کیں۔ کیا وہ سب ایک خواب تھا؟ وہ اٹھ کر تیزی سے باہر والے کمرے کی طرف جانے لگا تو ابا نے اسے روکا اور کہا:

''وہ اپنے بچوں کو لے کر فجر والی گاڑی سے اپنے گاؤں چلی گئی۔ تمہاری ماں نے صبح بھی ان تینوں کو ناشتہ کرا دیا تھا۔ چائے البتہ بغیر دودھ کے پلائی۔ جاتے جاتے وہ تمہیں بہت دعائیں دے کر گئی۔ وہ اور اس کے بچے گھر میں بھی آئے تھے۔ تمہارے پلنگ کے پاس کھڑے ہو کر بہت دیر تک تم کو دیکھتے رہے۔ ایک بچے نے تمہارا ہاتھ بھی چھوا تھا۔''

''کیوں ابا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں!'' ابا مسکرائے اور اماں کی طرف چلے گئے۔

آج اتوار تھا۔ ناشتہ کر کے وہ آنگن میں پڑے پلنگ پر لیٹ گیا اور نیلے آسمان کو دیکھنے لگا جہاں بے شمار پرندے بہت اونچائی پر اڑ رہے تھے۔

عابد نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا کہ ہو بہو اس کی شکل کا ایک پرندہ ان تمام پرندوں سے کہیں زیادہ اوپر بغیر پنکھ ہلائے خاموشی سے اڑ رہا ہے اور زمین پر عابد کے گھر کے آنگن میں لیٹے عابد کو دیکھ کر ایک ایسا سریلا نغمہ گا رہا ہے جو عابد نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

□□

Syed Mohd Ashraf,
Cheaf Income Tax Commissioner
26, Nizam Place, Kolkata-700020

کہانی

توبہ

مشتاق اعظمی

دھلی کی تاریخی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ اسے دیکھنے کی خواہش میرے دل میں برسوں سے مچل رہی تھی۔ دادا جان بھی ابا کو کئی بار لکھ چکے تھے کہ اس بار تعطیل میں مشتاق کو میرے پاس دلی ضرور بھیج دیا جائے۔ میری بار بار کی ضد اور دادا جان کی خواہش رنگ لائی اور ابا جان نے پچھلے سال مجھے گرمیاں گزارنے کے لیے دلی بھیج ہی دیا۔ بڑا مزا آیا دلی کی سیر کرنے میں۔ میں نے اپنے نئے نئے دوستوں کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منائیں۔ وہاں مجھے جو دوست ملے ان میں جمال، ریاض، انور اور پرویز ایسے تھے جو میرے ساتھ میں ایسے اور اتنی جلدی گھل مل گئے جیسے برسوں کی دوستی ہو۔ روز نیا نیا پروگرام بنتا تھا۔ کبھی لال قلعہ جانے کا کبھی قطب مینار اور کبھی نظام الدین اولیاؒ کی بستی میں۔ ان دوستوں میں مجھے پرویز کی ایک بات سخت حیرت میں ڈالے ہوئے تھی۔ وہ نہ جانے کیوں ہر وقت اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رہتا تھا، اور اسے کسی کے سامنے اپنی آنکھوں سے جدا نہیں کرتا تھا۔ میں نے یہ بات پرویز سے پوچھنی مناسب نہ سمجھی اور دوسرے دوستوں سے معلوم کرنا چاہا۔ مگر کوئی بھی مجھے ٹھیک سے جواب نہ دے سکا۔

ایک دن ہم نے مغل گارڈن کی سیر کا پروگرام بنالیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اگلی صبح سات بجے تمام ساتھی میرے گھر پہنچ جائیں گے، اور پھر وہاں سے تقریباً ساڑھے سات بجے مغل گارڈن کے لیے روانہ ہوں گے۔

دوسرے روز ٹھیک سات بجے پرویز میری قیام گاہ پر پہنچا۔ ریاض، جمال اور انور کے آنے میں کچھ دیر تھی میں اپنے کمرے میں پرویز سے گپ شپ کرنے لگا۔ باتوں کے درمیان دفعتاً پرویز کو چھینک آئی اور اس کا چشمہ اپنی جگہ سے کھسک کر نیچے آگیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ پرویز کی ایک آنکھ غائب ہے۔ صرف دونوں پپوٹے لپٹے ہوئے ہیں۔ موقع غنیمت جان کر میں نے کہا "بھائی پرویز اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بات پوچھوں؟"

پرویز نے اجازت دے دی تو میں نے اس کی ایک آنکھ ضائع ہونے کا سبب پوچھا۔ پرویز نے ایک سرد آہ بھری اور کہا

''دوست میری زندگی کی یہ ایک ایسی داستان ہے جسے میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ چونکہ یہ واقعہ میرے وطن الہ آباد میں پیش آیا تھا اس لیے یہاں کے لوگ اس کے بارے میں بالکل نہیں جانتے، اور اگر کوئی پوچھتا بھی ہے تو میں اسے ٹال دیتا ہوں، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ یہ واقعہ دہرا کر اپنی کھوئی ہوئی آنکھ کی یاد تازہ کروں۔ مگر تم پوچھ رہے ہو تو سناتا ہوں۔

''یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا معمول تھا کہ میں اکثر اسکول سے آنے کے بعد غلیل لے کر چڑیوں کے شکار میں چلا جاتا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کے لیے سخت باتیں سننی پڑتیں اور سزائیں بھی ملتی تھیں۔ مگر میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ چوری چھپے کسی نہ کسی بہانے سے پرندوں کو ستایا کرتا تھا۔ ایک دن ابا جان گھر پر موجود نہ تھے۔ میں نے اپنی غلیل لی اور سیدھا باغ کی طرف روانہ ہوا۔ امی جان نے کہا ''بیٹا! دیکھو یہ زمانہ پرندوں کے انڈے بچے دینے کا ہے، کم از کم اس موسم میں تو انہیں چین سے رہنے دو۔''

مگر میں نے کہا ''آپ تو نہ جانے کیوں میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ جو جانور حلال ہو اس کا شکار کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟'' اس کے بعد میں باغ کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں میری نظر ایک عمارت کی منڈیر پر پڑی۔ ایک مینا بہت اچھے موقع سے بیٹھی ہوئی تھی۔ بس پھر کیا تھا میں نے پتھر کا غلہ اٹھایا اور نشانہ تاک کر جھٹ غلیل چلا دی۔ لیکن...''

اتنا کہہ چکنے کے بعد پرویز ہچکچانے لگا اور اس پر گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔ میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا ''ہاں پھر کیا ہوا؟''

''ہوا یہ کہ مینا پہلے ہی اڑ گئی اور پتھر کا غلہ منڈیر سے ٹکرا کر واپس میری داہنی آنکھ میں آ لگا میں وہیں چکرا کر گر گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا معلوم نہیں جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اسپتال میں پایا میری داہنی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اور ابا جان قریب ہی اداس بیٹھے تھے تقریباً ایک ماہ بعد اسپتال سے چھٹی ملی تو معلوم ہوا کہ میری داہنی آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ ظلم اور نافرمانی کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اب زندگی بھر کے لیے ایک عیب نمایاں ہو چکا تھا اور مجھے اپنا یہ عیب چھپانے کے لیے سیاہ چشمے کا استعمال کرنا پڑا۔ اس حادثہ کے بعد میں نے پرندوں کو ستانے اور والدین کی نافرمانیوں سے توبہ کرلی۔ مگر یہ توبہ میری بینائی واپس نہ لاسکی۔''

پرویز نے جیسے ہی یہ واقعہ ختم کیا ویسے ہی ریاض، جمال اور انور کمرے میں داخل ہوئے اور کچھ دیر بعد ہم لوگ مغل گارڈن دیکھنے چلے گئے۔ مجھے رہ رہ کر پرویز کی غلیل یاد آتی رہی!

Prof Mushtaq Azmi ,
Azmi Mansion 25 Mitra Road Asansol -713301

ایم یوسف انصاری

سچ گھڑنے والا

ایک گاؤں میں ایک شخص رہتا تھا۔اس کا اصلی نام تو نہ جانے کیا تھا لیکن وہ حق ساز کے نام سے مشہور تھا جس کا مطلب ہے سچ بنانے والا۔ عام لوگ تو جھوٹ گھڑتے ہیں مگر وہ سچ گھڑتا تھا۔ وہ جھوٹی باتوں کو اپنے دلائل سے سچ ثابت کر دیتا تھا۔ فضول باتوں کو بامعنی بنا دیتا تھا۔ بڑا حاضر جواب اور عقل مند تھا۔ اس کے دوستوں نے فیصلہ کیا کہ اس کا امتحان لینا چاہئے۔انھوں نے پہلے ہی سے اپنے سوالات سوچ رکھے تھے۔ایک دن حق ساز کے مکان پر محفل جمی وہاں لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کہیں مگر حق ساز نے جھوٹی باتوں کو سچ بنا دیا اور مشکل سوالوں کے آسان جواب دے کر اپنی دھاک جما دی۔

ہرن کا شکار

پہلے دوست نے ہرن کے شکار کا واقعہ سنایا:

”ایک دن میں ہرن کا شکار کرنے گیا، ایک ہرن کو دیکھ کر میں نے گولی چلائی، گولی اس کے کھر میں لگی اور اس سے نکل کر ہرن کے بھیجے میں گھس گئی۔اب بتاؤ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“

حق ساز نے جواب دیا ”درست فرمایا آپ نے ۔ایسا ہی ہوا ہوگا، جب گولی چلی تو ہرن اپنے پیر سے سر کھجا رہا تھا۔“

جواب سن کر دوست عش عش کرنے لگے۔

شیر کا شکار

دوسرے دوست نے شیر کے شکار کا قصہ بیان کیا۔

”میں بھی ایک دن شکار کرنے گیا۔میں نے ایک لمبا چوڑا اور تگڑا

شیر دیکھا۔ اسے دیکھ کر میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ہاتھوں سے بندوق گر گئی اور میں بھاگنے کے لیے مڑا تب ہی میرے کانوں میں شیر کی آواز آئی ڈھچوں ڈھچوں۔ آواز سن کر میں رک گیا۔ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟"

حق ساز نے کہا "بے شک ہوسکتا ہے۔ دراصل گدھا ہی تھا جو شیر کی کھال میں تھا۔"

ہرن کے پاؤں میں چکی

تیسرے دوست نے یہ قصہ سنایا:

ایک گاؤں کے لوگوں نے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ اتفاق سے ایک رات کوئی ہاتھی ادھر سے گذرا۔ صبح کو جب لوگوں نے ہاتھی کے پیروں کے نشانات دیکھے تو دنگ رہ گئے۔ ایک شخص نے کہا یہ کیسے نشانات ہیں؟ لال بجھکو سے پوچھنا چاہیے۔ لال بجھکو آئے۔ نشان دیکھے۔ کچھ سر ہلایا کچھ داڑھی کھجائی اور بولے۔ ہوں ں!

بوجھ گئے لال بجھکو اور نہ بوجھا کوئے
کہیں پاؤں میں چکی باندھ کے ہرن نہ کودا ہوئے

لوگوں نے کہا، لال بجھکو نے سب کو بے وقوف بنایا۔ کہیں ہرن بھی چکی باندھ کر کود سکتا ہے؟

حق ساز نے کہا، "بے شک ہرن ایسا نہیں کرسکتا۔ دراصل نے پاؤں میں ربر اسٹامپ باندھ رکھے تھے۔"

بلّی اور بندر

ایک دوست نے کہا: "بھائیو مجھے دو بلیوں اور بندر کی کہانی فراڈ

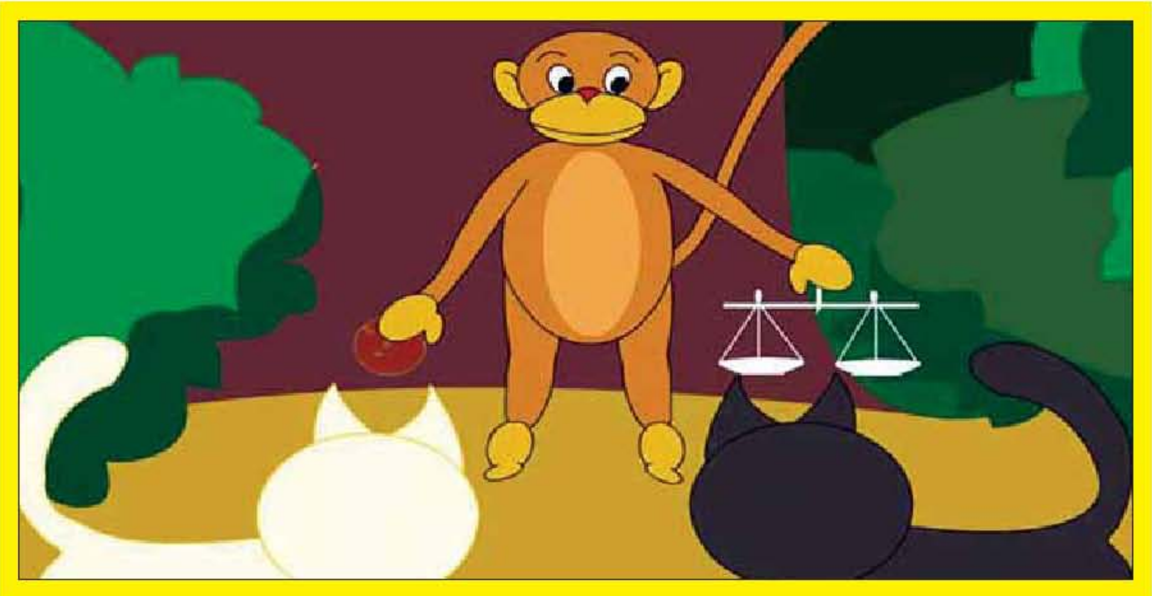

حالت میں اپنی اولاد کو خطرے سے بچانے کی کوشش کرتی ہے!"

سب لوگوں نے حق ساز کی تعریف کی۔

برفانی ریچھ

ایک دوست نے پوچھا: "قطبی ریچھ یعنی پولر بیئر Polar Beer بار بار اپنی ناک کیوں کھجاتا رہتا ہے؟"

حق ساز نے کہا، "قطبی ریچھ برفانی علاقے کا جانور ہے قدرت نے اسے سفید رنگ کا بنایا ہے تاکہ اپنے ماحول میں کھپ جائے۔ مگر اس کی ناک کالے رنگ کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مارا جاتا ہے سفید ریچھ جب شکاری کی بو پاتا ہے تو پنجوں سے اپنی ناک کھجاتا نہیں بلکہ چھپاتا ہے شکاری اسے ڈھونڈتا ہی رہ جاتا ہے اور یہ نو دو گیارہ ہو جاتا ہے۔"

مہتاب رائے

ایک دوست نے کہا: "ایک شخص نے دوسرے سے اس کا نام پوچھا تو دوسرے شخص نے جواب دیا ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا۔ بتاؤ اس شخص کا نام کیا تھا؟"

حق ساز نے فوراً جواب دیا، "اس کا نام تھا مہتاب رائے! ہم کو الٹ کر پڑھیں تو مہ بنتا ہے۔ بات کو الٹ دو تو تاب بنے گا اور یار کو الٹ کر پڑھیں تو بنے گا رائے۔ تینوں کو ملا کر پڑھیں تو مہ تاب رائے کا نام بن جائے گا۔"

تمام دوست حق ساز کی عقل مندی سے دنگ رہ گئے۔

□□

M Yusuf Ansari
368, New Ward, Malegaon Nasik- 423203

معلوم ہوتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

حق ساز نے جواب دیا، "دوستو یہ کہانی ہمارے ملک کی سب سے سچی کہانی ہے۔ اس میں بندر سے مراد دراصل انگریز ہے اور ہندو اور مسلمان دونوں بلیاں ہیں۔ دونوں نے آپس کی لڑائی میں انگریز کو بچولیا بنا لیا اور انگریز بندر نے دونوں کو بے وقوف بنا کر ہندوستان پر قبضہ جما لیا!"

گدھا اور گھوڑا

محفل میں بیٹھے ایک شخص نے پوچھا: "اگر گدھا اور گھوڑا قد اور رنگت میں بالکل ایک جیسے ہوں تو کیسے پہچانیں گے کہ گدھا کون ہے اور گھوڑا کون؟"

حق ساز نے جواب دیا، "گھوڑے کے کان چھوٹے اور کھڑے ہوتے ہیں، جب کہ گدھے کے کان لمبے اور جھکے ہوتے ہیں۔"

ماں بیٹی

اسی دوست نے پوچھا: "ایک ہی رنگ و روپ اور جسامت کی دو گھوڑیاں ماں بیٹی ہوں تو کیسے پتہ چلے گا ماں کون ہے اور بیٹی کون؟"

حق ساز کا جواب یوں تھا: "دونوں گھوڑیوں سے گہرا دریا پار کراؤ۔ جو گھوڑی آگے چلے گی وہ ماں ہے اور جو پیچھے پیچھے چلے گی وہ بیٹی۔ ماں ہر

محمد قیوم میو

چور لڑکا

کالونی کے سبھی بچے انھیں چاچاجی کہہ کر پکارتے تھے اور اکثر ان ہی سے آئس کریم خریدتے تھے۔ یوں تو وہ سبھی بچوں سے مزے مزے کی باتیں کرتے تھے لیکن اسکول جانے والے بچوں سے ان کی خاص پٹتی تھی۔ وقت ہو تو وہ انھیں پریوں اور جنوں کی کہانیاں بھی سنا دیتے تھے۔اس روز بھی درجنوں بچے چاچاجی کے اردگرد جمع ہو کر بیٹھ گئے اور ان سے کہانی سنانے کی ضد کرنے لگے۔

بچوں کے بے حد اصرار پر وہ کہانی سنانے پر رضامند ہو گئے۔ وہ بچوں کو مخاطب کر کے بولے۔

''اچھا بچو! آج میں تمھیں ایک سچّی کہانی سناتا ہوں۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جس نے بچپن سے بُری عادتوں میں پڑ کر اپنی زندگی تباہ کر لی۔ وہ ان دنوں دس سال کا خوبصورت لڑکا تھا۔

اس کے ماں باپ غریب و مفلس تھے۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے لاڈلے کو پڑھا لکھا رہے تھے تاکہ وہ بڑا ہو کر ان کا نام روشن کر سکے اور

بڑھاپے میں ان کا سہارا بن سکے۔ ایک بار کا ذکر ہے وہ اسکول میں بیٹھا تھا کہ اس کے پڑوس میں رہنے والے دوست نے اسے ایک خوبصورت قلم دکھایا، جو سنہرے رنگ کا تھا۔ ان دنوں ایسے پین کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ غریب آدمی تو اسے خریدنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ شام کو جب وہ اسکول سے گھر آیا تو اپنے والدین سے اس جیسا پین لانے کی ضد کرنے لگا جس پر اس کے غریب والد نے اسے سمجھایا اور کہا:

"نہیں بیٹا! اچھے بچے کبھی مہنگی چیزوں کی ضد نہیں کرتے۔ ہماری اتنی حیثیت نہیں جو ہم تمہیں اتنا مہنگا پین خرید کردیں۔ جاؤ جو سستا پین تمہارے پاس ہے اسی سے کام چلاؤ۔ اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے شاباش!" پر وہ کہاں اتنی جلدی ماننے والا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی فرمائش پوری نہیں ہوگی۔ تو وہ والدین سے ناراض ہوکر اسکول چلا گیا۔ دو چار روز کے بعد اس نے اپنے دوست کا پین اس کے بستے سے چوری کرکے کہیں چھپا دیا۔ پین کی چوری پر پورے اسکول میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ وہ پین تھا ہی اتنا خوبصورت اور دل لبھانے والا جسے دیکھ کر ہر ایک کی نیت خراب ہوجائے۔

سبھی اسکول کے بچوں کے بستوں کی تلاشی لی گئی، لیکن پین کہیں نہیں ملا۔ جب اس کی باری آئی تو وہ گھبرا گیا، اور پسینہ میں شرابور ہوگیا، اور بوکھلاہٹ میں وہ اپنی تلاشی دینے سے انکار کرنے لگا۔ اسکول کے سبھی ٹیچروں نے زبردستی اس کی تلاشی لی۔ وہ سنہرا پین اس کے بستے سے ہی نکلا۔ پرنسپل نے فوراً اس کے والد کو بلالیا۔ پرنسپل نے والد سے اس معاملے کی شکایت کردی، اور پھر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسکول سے اسے خارج کردیا گیا۔ اس کے والد اپنے اکلوتے بیٹے پر چوری کا الزام برداشت نہ کرسکے، اور اس سے روٹھ کر دور بہت دور چلے گئے۔ ہمیشہ کے لیے۔ وہ لڑکا یوں ہی ان پڑھ اور گنوار رہ گیا۔ اس کے بعد وہ کسی اسکول میں داخلہ نہ لے سکا۔ کیونکہ لوگوں نے اسے چور کا خطاب دے دیا تھا۔ جس سے پیچھا چھڑانے کی وہ لاکھ کوشش کرتا مگر یہ نام تو جیسے اس کی زندگی کے ساتھ جُڑ چکا تھا۔ وہ اپنے کیے پر اب بھی بہت پشیمان اور نادم ہے۔ میرا اب کیا ہوسکتا ہے؟ اور پھر گیا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ آج وہ لڑکا بوڑھا اور کمزور ہوچکا ہے۔ بچو! تم کبھی اس لڑکے جیسا بُرا کام مت کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس کی طرح پڑھائی لکھائی سے محروم رہ جاؤ۔ اور تمھارے ماں باپ کے سپنے بھی ٹوٹ جائیں۔ اور تمھیں بھی اس کی طرح گلی گلی گھوم کر آئس کریم بیچنی پڑے۔ ہاں میرے پیارے بچو۔ مجھے یوں حیرت سے مت دیکھو۔ تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ وہ چور لڑکا میں ہی ہوں، تمہارا آئس کریم والا چاچا، جس نے وہ سونے جیسا پین چوری کیا تھا۔"

بچوں کے منہ حیرت سے کھلے تھے۔ چاچا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرگئی تھیں۔

Mohd Qayyum Meo
A-4, Ayub Manzil, Karim Nagar
PO Taj Gunj, (Agra) 282001-UP

عربی کہانی

□ ترجمہ: فردوس بانو

نیولا

یہ کہانی عربی کی مشہور کتاب 'کلیلہ و دِمنہ' Kalilah wa Dimnah سے لی گئی ہے۔ دراصل یہ کتاب 'پنچ تنتر' یعنی 'پانچ طریقے' کی قدیم ہندوستانی کہانیوں پر مشتمل ہے جنھیں حضرت عیسیٰ سے تین سو سال پہلے سنسکرت کے ایک عالم وشنو شرما نے جمع کیا تھا۔ یہ جانوروں کی کہانیاں ہیں اور دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں برزویا نے ان کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس بعد 750 عیسوی میں فارسی کے عرب عالم عبداللہ ابن المقفّع Abdullah Ibn al-Muqaffa نے عربی میں 'کلیلہ و دِمنہ' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔ یعنی سنسکرت سے یہ کہانی فارسی میں گئی، فارسی سے عربی میں اور عربی سے اب اردو میں آپ کے سامنے آرہی ہے۔ **اعزازی مدیر**

بادشاہ دشلیم نے بیدبا فلسفی سے کہا، اُس جلد باز شخص کی حکایت سناؤ جو بغیر غور و فکر کیے اور انجام سے بے نیاز جلد بازی میں قدم اٹھاتا ہے۔

فلسفی نے کہا، وہ شخص یقیناً شرمندہ ہوتا ہے جو کسی معاملے میں غور و فکر نہیں کرتا اور اپنے اوپر قابو نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کا انجام وہی ہوتا ہے جو نیولے کے قتل کے بعد ایک نیک عبادت گزار یعنی عابد شخص کا ہوا تھا حالانکہ وہ نیولے سے بہت پیار کرتا تھا۔

بادشاہ نے پھر کہا، وہ کیا واقعہ ہے ذرا مجھے بھی تو سناؤ۔

فلسفی نے سنانا شروع کیا کہ کہا جاتا ہے ملک جرجان میں ایک عابد شخص رہتا تھا، اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ کئی سال گزر گئے ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ دونوں میاں بیوی بہت اداس رہتے تھے۔ لمبی مایوسی کے بعد بیوی کو احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ چہرے پر خوشی دیکھ کر عابد شخص سمجھ گیا اور بیوی سے پوچھا۔ بیوی نے خوش خبری سنائی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ عابد کی خوشی کی حد نہ تھی۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ ہمارے یہاں ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہوگا۔ جو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا، میں اس کے لیے ایک خوبصورت نام کا انتخاب کروں گا، اور نام منتخب کرنے کے لیے میں دنیا کے بڑے ادیبوں کو جمع کروں گا۔

بیوی نے کہا، میرے سرتاج آپ وہ بات کیوں کہتے ہیں جس کا اختیار آپ کو نہیں ہے اور نہ اس کا آپ کو علم ہے۔ ایسا کام جس نے بھی کیا اس کے ساتھ وہی پیش آتا ہے جو اس شریف آدمی کو پیش آیا تھا، جس نے اپنی حرکتوں سے تمام شہد اور گھی اپنے سر پر بہا لیا تھا۔

شوہر نے بیوی سے کہا، وہ کیا ماجرا ہے، میں بھی تو جانوں۔ بیوی نے کہا، ایک شریف آدمی کے پاس کھانے کے لیے روزانہ ایک تاجر

کے یہاں سے شہد اور گھی آتا تھا، وہ اپنی ضرورت بھر کھالیتا اور باقی ایک مٹی کے گھڑے میں رکھ کر سر کے پاس دیوار میں ایک کھونٹی پر لٹکا دیتا، رفتہ رفتہ وہ گھڑا بھر گیا۔ ایک روز وہ ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا کہ اس کی نظر بھرے ہوئے گھڑے پر پڑی۔ اس نے اس مال کی قیمت کا اندازہ لگایا اور دل ہی دل میں سوچا کہ اگر میں پورا گھڑا بیچ دوں تو مجھے اتنے دینار حاصل ہوں گے، پھر میں اس دینار سے چند بکریاں خرید سکتا ہوں، پھر وہ بچے دیں گی۔ پھر ان کے بچے بڑے ہوکر بچے دیں گے، کچھ دنوں میں میرے پاس بہت زیادہ بکریاں ہوجائیں گی، پھر میں انھیں بیچ کر گائے اور بیل خریدوں گا اور بچے ہوئے پیسے سے کھیت خریدلوں گا۔ پھر گائے بچہ دے گی تو دودھ اور اس کی نسل سے اضافہ ہوگا۔ پھر میں بیلوں سے کھیتی کروں گا، دودھ بیچوں گا اور چند دنوں میں ایک امیر آدمی بن جاؤں گا۔ پھر تو میرے چاروں طرح کام کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہے گی اور ایک لمبی چوڑی اور خوبصورت حویلی بنواؤں گا اور پھر ایک اور خوبصورت عورت سے شادی کروں گا، اس سے حسین وجمیل بچے پیدا ہوں گے۔ ان کے اچھے اچھے نام رکھوں گا۔ انھیں ادب وتہذیب سکھاؤں گا۔ ضرورت پڑے گی تو ان پر سختی بھی کروں گا۔ اگر نہیں مانیں گے تو انھیں اس ڈنڈے سے ماروں گا۔ یہ بات کہتے ہوئے اس نے بغل میں رکھا ہوا ڈنڈا اٹھایا جو دیوار سے لٹکے ہوئے گھڑے سے جاٹکرایا اور گھڑا ٹوٹ گیا۔ اس طرح گھڑے میں بھرا شہد اور گھی اس کے سر پر بہہ گیا۔ کہانی سنا کر بیوی نے کہا کہ یہ مثال میں نے اس لیے بیان کی کہ آپ اس بات کے ذکر میں اس قدر جلد بازی سے کام نہ لیں جس کا ذکر مناسب نہیں اور جس کے بارے میں آپ نہیں جانتے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط۔

کچھ مہینوں کے بعد ان کے یہاں ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہوا۔ باپ بہت خوش ہوا۔ ایک روز بیوی نہانے کے لیے غسل خانے گئی اور شوہر کو بیٹے کے پاس چھوڑ گئی تاکہ وہ بچے کی نگرانی کرتا رہے۔ اسی درمیان بادشاہ کا ایلچی اسے بلانے آگیا۔ اس نے بیٹے کے پاس اس کی نگرانی کے لیے اپنے نیولے کو چھوڑ دیا جسے اس نے تب سے پالا تھا جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ نیولا اس کے بیٹے کی نگہبانی بھی کرتا تھا۔ عابد دروازہ بند کر کے ایلچی کے ساتھ چلا گیا۔ اسی وقت گھر کے کسی بل سے ایک کالا سانپ نکلا اور بچے کے قریب پہنچا۔ یہ دیکھتے ہی نیولا سانپ پر جھپٹ پڑا اور دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ نیولے نے بچے کو بچانے کے لیے سانپ پر پے بہ پے کئی حملے کیے اور قتل کر کے سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہاں تک کہ خود خون میں لت پت ہوگیا۔ جب عابد شخص واپس آیا اور دروازہ کھولا تو نیولا فاتحانہ انداز میں خوش خبری سنانے کے لیے دروازے پر پہنچا۔ جب عابد شخص نے نیولے کو خون میں لت پت دیکھا تو وہ خوف زدہ ہوگیا، اس کی عقل اڑ گئی، اور گمان گزرا کہ اس نے بچے کو مار ڈالا۔

ایسے عالم میں وہ ہوش کھو بیٹھا اور نیولے کے سر پر کئی وار کر دیے جس سے نیولے نے دم توڑ دیا۔ عابد بھاگا ہوا بچے کی طرف بڑھا، دیکھا کہ بچہ صحیح سلامت ہے اور اس کے قریب ہی کالے سانپ کے کئی ٹکڑے پڑے ہیں۔ دیکھتے ہی سارا ماجرا اس کی سمجھ میں آگیا اور وہ اپنی جلد بازی اور بے عقلی پر اپنا سر پیٹنے لگا اور کہنے لگا ہائے افسوس اس لڑکے کی وجہ سے میں نے اتنا بڑا دھوکہ کھایا اور ایک معصوم کی جان لے لی۔ اسی وقت عورت غسل خانے سے نکلی اور اپنے شوہر اور وہاں کے منظر دیکھ کر لرز گئی۔ دریافت کیا کہ یہ سب کیا ہے تو عابد شخص نے نیولے کی نیکی اور اپنی بدی کے بارے میں بتایا۔ بیوی نے کہا، یہ ہے جلد بازی کا انجام۔ جو آدمی اپنے اوپر قابو نہیں رکھتا اور جلد بازی سے کام لیتا ہے اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

□□

Firdos Bano A-187-3, 2nd Floor, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

راشد جمال فاروقی

شاہ جہاں زندہ باد!

بچو! تم نے شاید آگرہ کا تاج محل اور دلی کا لال قلعہ دیکھا ہوگا۔ اس قدر خوبصورت عمارتیں بنوانے والے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کا نام بھی تم ضرور جانتے ہوگے۔ شاہ جہاں بہت بہادر، عقل مند، خوبصورت، انصاف پسند اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمراں تھا۔ اسے ہندوستان اور اس کے عوام سے بے حد پیار تھا۔ وہ مذہب کی بنیاد پر کسی سے بھید بھاؤ نہیں کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا وطن امن، شانتی، بھائی چارے اور خوش حالی کا نمونہ بن جائے۔ اس بات کے لیے اس نے ہمیشہ کوشش کی کہ ہندوستان کی رعایا کا دکھ درد بانٹ سکے۔

آج ہم وہ کہانی سناتے ہیں جس سے تمہیں معلوم ہو سکے گا کہ اسے راج گدی پر بٹھانے میں کن لوگوں نے اس کی مدد کی اور وہ کس طرح کے لوگوں سے گھرا ہوا تھا۔ کون لوگ اس کے حامی، مددگار اور خیر خواہ تھے اور کون لوگ برے ہتھکنڈے اپنا رہے تھے۔

یہ قصہ اودے پور کے بادل محل کا ہے۔ مہابت خاں جو جہانگیر کا سپہ سالار تھا۔ اودے پور کے رانا کرن سنگھ کے ساتھ محل میں شاہ جہاں کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کے ہمراہ ملکہ نور جہاں کا وفادار بندرا کا راجا بھی موجود تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے شاہ جہاں رانا کرن سنگھ کا مہمان تھا۔ رانا کرن سنگھ نے اس کے عیش و آرام کا سب سامان مہیا کیا تھا۔ بلکہ شاہ جہاں کے لیے ایک شاندار محل اور ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی گئی تھی۔ مہابت خاں نے شاہ جہاں کے دشمنوں کا صفایا کر کے خود بادشاہ بن بیٹھنے کی بجائے دشمنوں کا جھنڈا اور شاہ جہاں کے والد (جن کا انتقال ہو چکا تھا) جہانگیر کا تاج سنبھال کر اس لیے رکھا تھا کہ شاہ جہاں کو یہ چیزیں پیش کی جائیں۔ رانا کرن سنگھ نے بھی اپنی فوجوں کے ساتھ شاہ جہاں کے لیے دشمنوں سے لوہا لیا تھا۔ جب کہ ملکہ نور جہاں کی فوجیں شاہ جہاں کا تعاقب کر رہی تھیں تو رانا کرن سنگھ

نے شاہ جہاں کو پناہ بھی دی اور فوجی مدد بھی۔

ہاں تو ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ رانا کرن سنگھ مہابت خاں اور راجا بندار، شاہ جہاں کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں شاہ جہاں کے تشریف لانے کا اعلان ہونے لگا اور وہ تشریف لے آئے۔ مہابت خاں نے انھیں دشمنوں کا جھنڈا اور شہنشاہ جہاں گیر کا تاج پیش کیا۔ شاہ جہاں نے مہابت خاں کا شکریہ ادا کیا۔ ان کی وفاداری کے وہ قائل تھا۔ شاہ جہاں نے مہابت خاں سے پوچھا کہ ملکہ نور جہاں کہاں ہیں؟ مہابت خاں نے بتایا کہ انھیں قید کیا جا چکا ہے۔ شاہ جہاں نے حکم دیا کہ اب انھیں آزاد کر دیا جائے اور دس ہزار اشرفیاں سالانہ ان کی پنشن کے طور پر ادا کی جاتی رہیں۔ پھر شاہ جہاں نے راجہ بندار سے پوچھا کہ باقی شاہی افراد کی کیا خبر ہے تو راجہ نے بڑے جوش کے ساتھ جواب دیا کہ اس نے خسرو کے دونوں بیٹوں کا قتل کر دیا ہے۔ شہریار کی آنکھیں نکال دی گئیں ہیں اور اس کے بیٹے کو بے رحمی سے ذبح کر دیا گیا ہے۔ شاہ جہاں یہ سن کر کانپ گیا۔ غصے سے کانپتے ہوئے اس نے مہابت خان کو حکم دیا کہ اس خبیث جلاد کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ یہ زندہ رہے گا تو یہ سب کرتا رہے گا۔ بادشاہ کو سخت افسوس تھا کہ اس کے عزیز و اقارب کو اس طرح بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور وہ بے خبر اور بے بس رہ گیا۔ مہابت خان نے محل سے باہر جا کر جلاد کو گولی مار دی۔ اب شاہ جہاں رانا کرن سنگھ مخاطب ہو کر بولا:

”رانا صاحب آپ نے ہمارے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ تو ہم جیتے جی چکا نہیں سکیں گے۔ آپ نے ہماری فوجی مدد فرمائی، ہمیں پناہ دی، ہمارے لیے محل اور مسجد تعمیر کرائی۔ اتنے احسان تلے آپ نے ہمیں دبا دیا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ آپ کے ساتھ کیا حسنِ سلوک کیا جائے۔“

رانا کرن سنگھ

رانا کرن سنگھ نے جواب دیا ”شہنشاہ! میں نے وہی کیا جو میرے ضمیر نے مجھے حکم دیا اور جو میرے وطن کے حق میں تھا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے چلے جانے کے بعد بھی آپ کی مسجد کی حفاظت اور حرمت قائم رکھی جائے گی۔“ شاہ جہاں نے یہ سب باتیں سنیں۔ کچھ دیر چپ رہا اور پھر بولا: ”رانا! میرے بھائی ادھر میرے پاس آؤ، میرے دوست تم نے دکھا دیا کہ تم ایک سچے راجپوت ہو، تم نے ایک مسلمان کی مدد کی، لیکن یہ بھی جان لو کہ میری رگوں میں دوڑنے والے خون کا تین چوتھائی حصہ راجپوت ہی ہے۔ لہٰذا آج سے ہم دونوں بھائی بھائی ہیں۔ تم اپنی پگڑی اتار کر مجھے دو۔“ رانا کرن سنگھ نے اپنی پگڑی شاہ جہاں کو پیش کر دی۔ شاہ جہاں نے اپنی پگڑی اتار کر کرن سنگھ کو پہنا دی اور ان کی پگڑی خود اوڑھ لی۔

پورا دربار نعرے سے گونج اٹھا:

”شہنشاہ شاہ جہاں زندہ باد! شہنشاہ شاہ جہاں زندہ باد!“

Rashid Jamal Farooqui
C-1452, IDPL Tourship, Virbhadra,
Rishikesh (Dehradun) UP-249202

نیا سال

ایم آئی ساجد

آیا بچو سال نیا پھر
جگ سے پرانا سال گیا پھر

نئے سال یہ کام کریں گے
لکھنا پڑھنا عام کریں گے
نیکی صبح و شام کریں گے
جگ میں روشن نام کریں گے

بستہ، کتب خوب پڑھائی
کوئی نہ دوجی سوچ ہو بھائی
ان پڑھ پن سے اپنی لڑائی
اصل یہی ہے اپنی کمائی

آؤ دونوں ہاتھ اٹھائیں
رب سے مانگیں آج دعائیں
سال نیا ہے کام میں لائیں
سوئے ہوؤں کو پھر سے جگائیں

سال نیا ہے نئی کہانی
کل کا سپنا بات پرانی
سب کے بھلے کی جس نے ٹھانی
کوئی نہ ہوگا اس کا ثانی

بچو میری بات کو سمجھو
سال نیا ہے بس میں کرلو
دیکھو آیا سال نیا پھر
جگ سے پرانا سال گیا پھر

Dr M I Sajid
Opp N P Urdu Primary School No 4, Zia Colony,
Khamgaon 444303 Dist Buldana (MS)

سہیل عالم

بیت چکا ہے ماہِ دسمبر
آیا ہے اک نیا کیلنڈر
نئے سال میں ہم بچوں کو
کیا کرنا ہے سوچیں آؤ
تعلیمی سرگرمی اپنی
یوں رکھیں گے ہم جاری
سیکھیں گے ہم لکھنا پڑھنا
دنیا میں ہے آگے بڑھنا
غلطی کوئی بیتے دنوں کی
اب نہ دوہرائیں گے کبھی
ہوں گے نہ اب ہرگز غافل
پڑھ لکھ کر بننا ہے قابل
بننا ہے اک اچھا شہری
اچھا بیٹا اچھا بھائی
کیا کیا حق ہیں ہم پر کس کے
لے کر چلتے ہیں سب رشتے
بچو ہو یہ مقصد اپنا
سچا ہندوستانی بننا
بانٹو پیار محبت ہر دم
تم سے کہتا ہے یہ عالم

Suhail Aalam
Sufi nagar, Bhual line Kamptee Maharashtra

□ مترجم: انیس الدین ملک/نظر ثانی: نصرت ظہیر

سائنس کی الف لیلہ

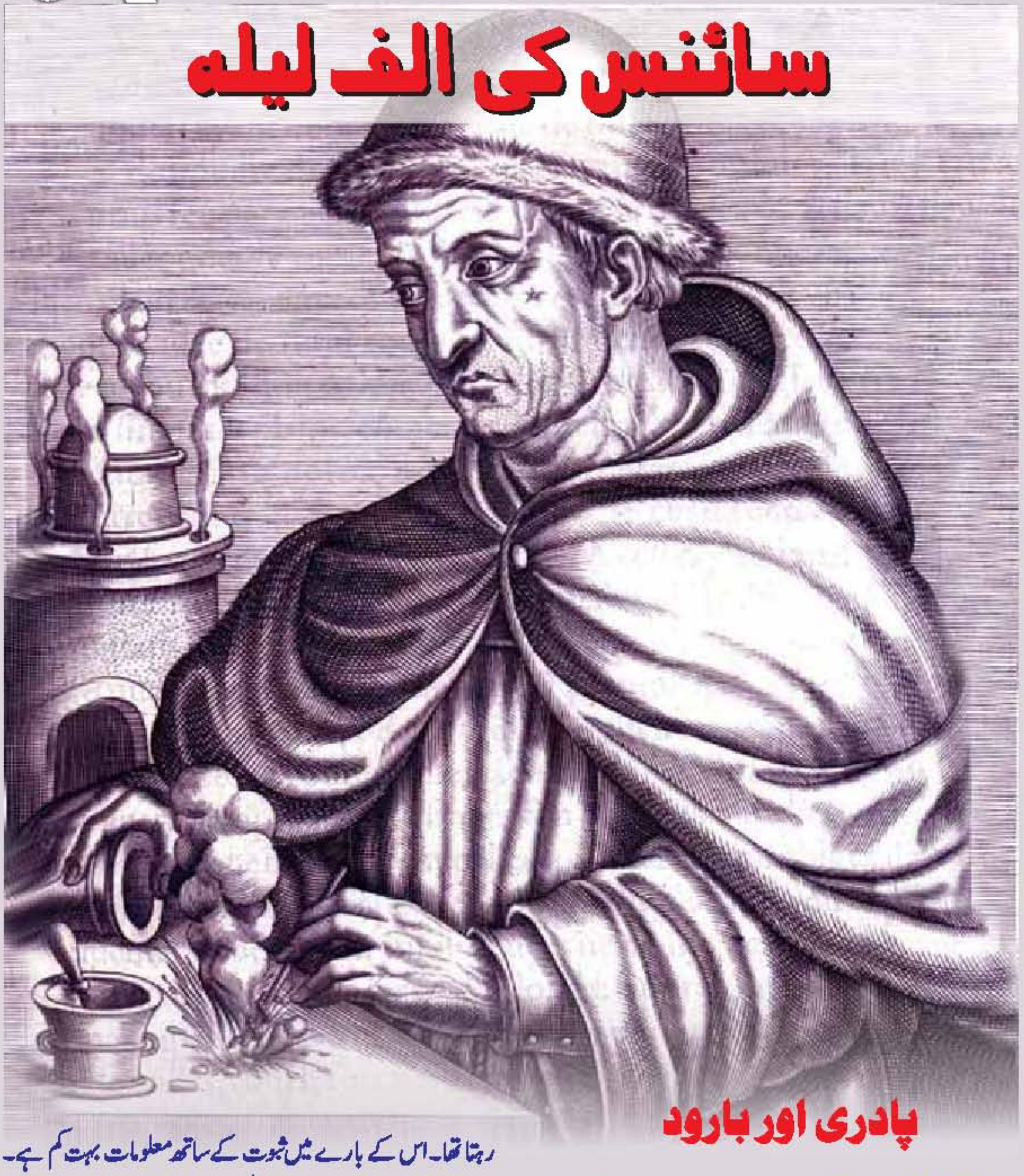

پادری اور بارود

کہتے ہیں چودھویں صدی میں برٹولڈ شوارز Berthold Schwarz ،عیسائیوں کے فرانسیسکن رتبہ کا ایک راہب یعنی پادری تھا جو جرمن کے نیورمبرگ یا غالباً فرا برگ شہر میں رہتا تھا۔ اس کے بارے میں ثبوت کے ساتھ معلومات بہت کم ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ داں اس کے اصلی نام میں بھی پورے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کچھ اس کا نام کونسٹیٹ انکلیٹزن بتاتے ہیں جبکہ کچھ ٹانیگر برکٹولڈس کا نام دیتے ہیں جس کا مطلب ہے کالا شیر۔ یہ اس کے

لیے بہت ہی مناسب نام تھا کیونکہ اس زمانے میں زیادہ تر لوگ سائنس کو کالا جادو ہی کہا کرتے تھے۔

برٹولڈ جو عیسائی خانقاہ کے آس پاس رہنے والے کسانوں کے لیے دوائیں تیار کیا کرتا تھا، اپنے ایک مریض کے لیے ایک دوا تیار کر رہا تھا جس میں گندھک کا شورہ اور لکڑی کا کوئلہ شامل تھا۔ اس نے غالباً ہر چیز کو باری باری کھرل میں مہین پیسا تھا اور پھر ان کو احتیاط سے آپس میں ملا دیا۔ اس نے اس سفوف یا پاؤڈر کو کھرل میں ہی رہنے دیا اور پتھر سے ڈھک دیا۔ کچھ دیر بعد اسے روشنی کی ضرورت پڑی۔ تب اس نے پتھر آگ جلانے کے لیے چقماق پتھر کو رگڑا۔ اتفاق سے چند چنگاریاں اڑ کر کھرل میں جا گریں جس سے سفوف میں آگ لگ گئی۔ فوراً ہی ایک زبردست آواز کے ساتھ دھماکہ ہوا۔ نتیجہ کے طور پر پتھر اتنی زور سے اوپر کی جانب اڑا کہ وہ عمارت کی چھت توڑ کر باہر نکل آیا۔ اس حادثے کے بعد جب برٹولڈ سنبھلا تو اس نے دیکھا کہ کھرل خالی ہے اور چھت میں ایک سوراخ ہے جس سے پتھر باہر نکل گیا تھا۔

1743 کی ایک جرمن تحریر میں اس واقع کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ تحریر کے مصنف کے مطابق برٹولڈ اس حیرت ناک چیز کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا جو پتھر کو اتنی طاقت سے اچھال سکتی ہے۔ اس لیے اس نے یہ سفوف کافی مقدار میں بنایا۔ پھر جیسا کہ جرمن مصنف نے لکھا ہے، اس سفوف کی طاقت کے بارے میں جاننے کے لیے وہ اتنا بے چین تھا کہ اس نے بے وقوفی میں اس سفوف سے ایک چڑے کا

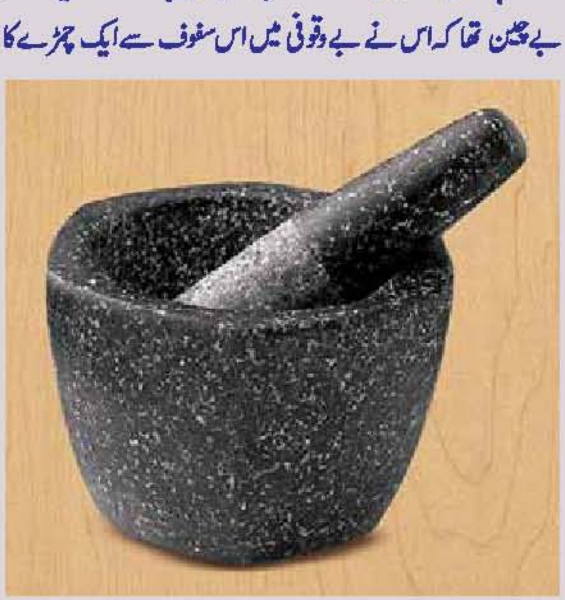

جنگ میں دشمن پر پتھر پھینکنے والی منجنیق Catapult کی ہو بہو نقل۔ یہ ایک میکینکل ہتھیار تھا

تھیلہ بھرا اور اس میں اپنی ٹانگیں ڈال دیں اور آگ لگالی۔ اس جلد بازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دھماکے سے اڑ گیا، اور کمرے کی چھت سے ٹکرا کر اس کا بھیجا باہر نکل آیا۔ کہانی کا یہ حصہ یقینی طور پر فرضی معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ شخص جس نے پتھر کو اس طاقت سے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ پتھر کی موٹی چھت کو بھی توڑ کر وہ باہر نکل گیا، وہی شخص ایسی احمقانہ حرکت کیوں کرے گا۔

خانقاہ کی چھت کو توڑ کر پتھر کے اڑ جانے کے اتفاقی حادثے سے برٹولڈ کو جنگ میں بارود کے ذریعے پتھر پھینکنے کا خیال آیا تھا۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اس نے کھرل یا اس جیسی کوئی چیز استعمال کی جو تھوڑی بھی تھی۔ اس کی پیندی میں اس نے بارود رکھا اور اس کے اوپر ایک بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ اب اس نے بارود میں آگ لگادی۔ ہوا میں پتھر زور سے اچھلا۔ گرچہ کھرل کو ایک خاص سمت میں رکھا گیا تھا لیکن اس 'آتشی اسلحے' یا آگ کے ہتھیار کا نشانہ صحیح نہیں تھا۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ کچھ ہی دنوں بعد کھرل کی جگہ لوہے کی ایک لمبی نلی استعمال کی گئی ہو۔ یقیناً اس نلی کا ایک سرا بند رہا ہوگا تاکہ اس طرف بارود رکھا جاسکے اور اس میں ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی جگہ چھوڑ دی گئی ہوگی جس سے بارود میں آگ لگائی جاسکے۔

اس زمانے میں لوہے کو ڈھالنے کا طریقہ نامعلوم تھا۔ اس لیے یہ سمجھا جاتا تھا کہ لوہے کی نلیاں، لوہے کی چھڑوں کو آپس میں ملا کر شکنجے سے کس کر بناتے ہیں جس طرح لکڑی کے پہیے لکڑی کے تختوں کو آپس میں ملا کر شکنجے سے کس کر بنائے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ان نلیوں یا توپوں کو لوہے یا پیتل کے ایک ہی ٹکڑے سے ڈھالا گیا۔

برٹولڈ نے اس قسم کی توپ کی ایجاد کی، اس بات کی صداقت کے بہت سارے ثبوت موجود ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس ایجاد کا کھرل میں بارود کے اتفاقیہ دھماکے سے کوئی تعلق نہ ہو، لیکن اس امکان کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کئی سو سال سے ہتھیار کے کسی بھی ٹکڑے کو مورٹار Mortar کہا جاتا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی شکل کیمیا کے ماہروں کے استعمال میں آنے والی کھرل سے ملتی جلتی ہو۔

سلطان محمد ثانی

اس کی نال بہت چھوٹی اور منہ بہت چوڑا ہوتا ہے اور ایسے گولے کافی اونچے زاویے سے داغے جاتے ہیں۔ تصویر میں جو سیکڑوں سال پرانی ایک پینٹنگ کی مدد سے بنائی گئی۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ چار مورٹار ایک قلعہ کی اونچی دیوار پر نشانہ لگا رہے ہیں۔

توپ سازی کا ایک ماہر جس کا نام کتمان تھا 17 مئی 1354 میں جاری کیے گئے فرانسیسی ٹکسال کے ایک بیان کا حوالہ دیتا ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جب فرانس کے بادشاہ کو اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ ایک راہب نے جس کا نام برٹولڈ شوارز ہے، توپ ایجاد کرلی ہے تو اس نے ٹکسال کے جنرل کو حکم دیا کہ وہ توپ بنانے میں کام آنے والی دھات کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔

ایک دوسرے تاریخ داں نے بیان کیا ہے کہ برٹولڈ بندوق کی ایجاد کے تقریباً 30 یا 40 سال بعد تک زندہ رہا، اور اس بات کے امکان کا اقرار کیا ہے کہ برٹولڈ توپ سازی میں خاص مہارت رکھتا ہوگا۔

جنگ میں بارود کے استعمال سے، لڑنے کے طریقوں میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ خاص طور سے 1500 عیسوی کے قریب جب دستی آتشی اسلحوں کا استعمال شروع ہوا، پچھلی لڑائیوں میں کام آنے والے غلیل نما گوپھن یا فلاخن اور ضرب یا چوٹ دینے والے ہتھیاروں Battering Arms کی جگہ زیادہ طاقتور ہتھیاروں نے لے لی۔ بالکل شروع کی بندوقوں میں سب سے مشہور بندوق وہ ہے جسے سلطان محمد ثانی نے 1453 میں قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران استعمال کیا تھا۔ روایت ہے کہ یہ بندوقیں چھ سو پونڈ سے زیادہ وزنی پتھروں کو سینکڑوں گز دور اس طاقت سے پھینکتی تھیں کہ یہ زمین میں ایک فیدھم کی گہرائی تک دھنس جاتے تھے۔ اس بندوق کو کھینچنے کے لیے 30 گاڑیوں کو ایک ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا اور اسے ساٹھ بیل کھینچتے تھے۔ گاڑیوں کے دونوں طرف دو دو سو آدمی چلتے تھے تاکہ بندوق ادھر ادھر نہ لڑھکے۔ 250 آدمی اس بندوق کے آگے چلتے تھے تاکہ راستہ صاف کریں اور راستہ میں آنے والے پلوں کی مرمت کرتے چلیں۔ اس بندوق اور دوسری بندوقوں کی مدد سے سلطان محمد ثانی نے جسے دنیا کا سب سے پہلا بندوق استعمال کرنے والا کہا جاتا ہے جلد ہی قسطنطنیہ کو فتح کرلیا باوجود اس کے کہ دشمنوں سے بچنے کے لیے شہر کے چاروں طرف تین موٹی دیواریں تعمیر کی گئی تھیں۔ سلطان کی عمر اس وقت صرف 21 سال تھی اور اس کی فتح سے روم کی ڈیڑھ ہزار سال پرانی سلطنت کا خاتمہ شروع ہوگیا تھا۔

قسطنطنیہ کی جنگ میں استعمال کی گئی توپ جیسی بندوق کی نقلی تصویر

بارود اور توپ کے استعمال سے جنگ سے محبت کرنے والے امیروں کا رعب دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا۔ بندوق اور بارود بہت قیمتی ہوا کرتے تھے اس لیے بہت ہی کم حکمراں اپنی فوج کے لیے اس کے اخراجات برداشت کر سکتے تھے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ بارود کے استعمال نے ترقی یافتہ قوموں کو مقامی لوگوں سے جنگ میں کامیاب دلانے میں بہت مدد کی۔ مثال کے طور پر سولھویں صدی میں بندوق اور بارود کے استعمال سے اسپین کے باشندوں نے بہت جلد

جنوبی امریکہ پر قبضہ کرلیا کیونکہ ان ہتھیاروں کے سامنے مقامی لوگوں کے تیر کمان اور زہریلے ڈارٹس Darts کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

یہ بات بھی کافی دلچسپ ہے کہ بارود کے پہلی بار استعمال پر کافی شکایتیں کی گئیں۔ اٹلی میں بارود کے استعمال پر یہ شکایت کی گئی کہ یہ معقول جنگ کے مقابلے میں بے حد وحشیانہ ہے۔ پرانے زمانے کے سور ماؤں نے اس جنگ کے طریقے کی زبردست مخالفت کی، جس میں جسمانی طاقت اور بہادری کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔

ایک مصنف نے 1500 عیسوی کے قریب کئی لوگوں کے تاثرات کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ”اب تک انسانوں کی تباہی کے لیے جو ہتھیار بنائے گئے ہیں، بندوق ان میں سب سے زیادہ خطرناک ہے جسے ایک جرمن نے ایجاد کیا اور جس کا نام نامعلوم ہے۔ اس ایجاد کے لیے اسے انعام ملا۔ اس کا نام کسی کو نہیں معلوم ورنہ اسے اس مہلک ہتھیار کے لیے، یہ دنیا جب تک قائم ہے، تب تک کوسا جاتا اور برا بھلا کہا جاتا۔“

اس طرح سولھویں صدی میں بھی اس نئے تباہ کن ہتھیار کے استعمال سے وہی خطرہ، تلخی اور شکایتیں ہوئیں جیسی کہ 1915 میں پہلی بار جنگ میں زہریلی گیس کے استعمال پر اور 1945 میں ایٹم بم کے استعمال ہونے پر سامنے آئی تھیں۔

سچ یہ ہے کہ بارود اور بندوق دنیا کی تاریخ کا پہلا کیمیکل ہتھیار ہے، جس نے انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ انسانوں کی جانیں لیں اور دنیا کے ہر خطے میں تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

ساحر لدھیانوی

گیت

ماں تو آنسو پونچھ لے اپنے، رونے کی کوئی بات نہیں
جب تک تیرے ساتھ ہوں میں، مت سوچ کہ کوئی ساتھ نہیں

اور ذرا سا پال دے مجھ کو، پھر میں تجھ کو پالوں گا
جو مانگے گی سو لاؤں گا، کوئی بات نہ ٹالوں گا
جو تیری جھولی میں نہ ڈالوں، ایسی کوئی سوغات نہیں
ماں! تو آنسو پونچھ لے اپنے رونے کی کوئی بات نہیں

دن بھر محنت کر کے جب میں شام کو واپس آؤں گا
اپنے پاس بٹھا کر تجھ کو پیار کے ساتھ کھلاؤں گا
تو ایسا مت سوچ کہ تیرے سر پر کوئی ہاتھ نہیں
ماں! تو آنسو پونچھ لے اپنے رونے کی کوئی بات نہیں

کچھ دن کی تو بات ہے ماں! یہ کچھ دن بھی کٹ جائیں گے
آج جو بادل چھائے ہیں وہ بادل کل چھٹ جائیں گے
جس کی اجلی صبح نہ ہو، ایسی کوئی کالی رات نہیں
ماں! تو آنسو پونچھ لے اپنے رونے کی کوئی بات نہیں
جب تک تیرے ساتھ ہوں میں، مت سوچ کہ کوئی ساتھ نہیں

نانی کا صندوق

□ کنہیالال کپور

بھلا بتائیے تو...

بیگم کہتی ہیں آپ خواہ مخواہ، منّے کے ماموں کو کوستے ہیں۔ ہمارا اصرار ہے کہ منّے کے ماموں کو نہ کوسا جائے تو پھر کسے کوسا جائے۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کہ ہم دونوں میں سے کون حق پر ہے۔ ہمارا تو سوفی صد خیال ہے کہ اس مصیبت کی تمام تر ذمہ داری منّے کے ماموں پر عائد ہوتی ہے۔ نہ وہ منّے کو اس کی سال گرہ پر 'معلومات کا انسائیکلوپیڈیا' تحفے میں دیتے، نہ منّا اسے پڑھنے کے بعد ہم سے طرح طرح کے سوال کر کے ہمیں جاہل ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ منّا ٹھہرا ایک کتابی کیڑا۔ اس نے صرف تین چار دنوں میں 'معلومات کا انسائیکلوپیڈیا' ختم کرڈالی۔ اس پر ستم یہ کہ وہ جو پڑھتا ہے اسے جھٹ یاد ہو جاتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے بعد اس کے سر میں یہ سودا سمایا کہ اپنے بڑوں کا امتحان لیا جائے۔ یعنی اس بات کی تحقیق کی جائے کہ یہ بزرگ قسم کے لوگ جو اپنے کو عالم وفاضل سمجھتے ہیں، دراصل کتنے پانی میں ہیں۔ ہم اخبار کا مطالعہ کررہے تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد منّے نے سوال کیا۔

''ڈیڈی۔ بھلا پنسلین کس نے ایجاد کی تھی۔''

ہم گھبرا سے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ بارہا ہم نے پنسلین کے ٹیکے لگوائے ہیں اور ٹیکہ لگواتے وقت ڈاکٹر کے علاوہ پنسلین کے موجد کو بھی دل ہی دل میں برا بھلا کہا ہے لیکن اس بات کے سراغ لگانے کی کبھی کوشش نہیں کہ کہ وہ بھلا مانس تھا کون جس نے اسے ایجاد کیا کہ امرت دھارا کی طرح ہر مرض کا واحد علاج ہے۔ لیکن ہمیں منّے کے سوال کا کچھ تو جواب دینا تھا کیونکہ ہم نے خود ہی اسے کئی بار نصیحت کی تھی ''بیٹا زیادہ سے زیادہ سوالات پوچھا کرو، اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔'' ہم نے ایک آدھ منٹ سوچنے کے بعد کہا ''پنسلین ڈاکٹر الہ دین کی ایجاد ہے۔''

منّے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''واہ

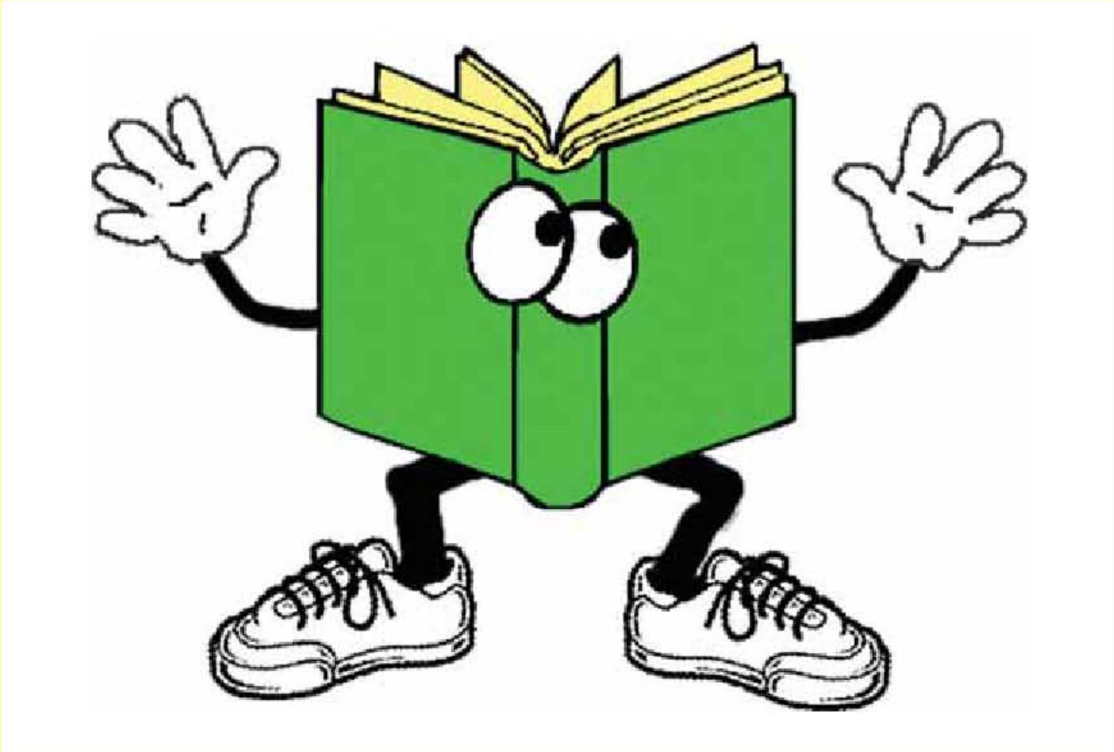

ڈیڈی! آپ مجھے بنا رہے ہیں۔ جناب پنسلین کا موجد سر الیگزینڈر فلیمنگ ہے۔"

ہم خفیف سے ہوگئے۔ اتنے میں منے نے دوسرا سوال داغ دیا

"اچھا بھلا بتایئے کہ دھنک میں سات رنگ کیوں ہوتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ خوب صورت لگے۔"

"سات سات رنگ ہی کیوں، چودہ یا اکیس کیوں نہیں۔"

"شاید اس لیے کہ قدرت اتنی فضول خرچ نہیں۔"

"اچھا تو یہ سات رنگ کیسے بنتے ہیں۔"

"بیٹا یہ سب خدا کی باتیں ہیں۔ انہیں خدا ہی جانتا ہے"

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نہیں جانتے۔ اچھا میں بتاؤں"

"ہاں بتاؤ۔"

"دیکھیے بارش تھم جانے کے بعد پانی کے مہین قطرے ہوا میں معلق رہ جاتے ہیں۔ جب ان میں سے سورج کی سفید کرنیں گزرتی ہیں تو وہ سات رنگوں میں بنٹ جاتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو دیکھیے معلومات کا انسائیکلو پیڈیا، صفحہ 25۔"

"اگر اس میں ایسا لکھا ہے تو ایسا ہی ہوگا"

"اچھا بتایئے ٹنکس ٹن کیا چیز ہے؟"

"ہمارے خیال میں یہ کوئی چینی شاعرہ ہے"

"بالکل غلط"

"تو پھر کوئی جھیل ہوگی"

"یہ بھی غلط۔"

"تو پھر شاید وزن تولنے والی مشین کو کہتے ہوں گے"

"سراسر غلط"

"معلوم نہیں کیا بلا ہوتی ہے"

"تعجب ہے، آپ کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ ٹنگس ٹن اس دھات کو کہتے ہیں جو بجلی کے بلب میں ہوتی ہے اور جو گرم ہونے کے بعد روشنی دینے لگتی ہے۔"

"اچھا منّا تم اب باہر جا کر کھیلو ہمیں اخبار پڑھنے دو۔"

"صرف ایک سوال اور... یہ بتائیے کہ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ کون سا ہے اور اس کا رقبہ کتنا ہے؟"

"ہمارے خیال میں لنکا یا سرڈینیا"

"حسب معمول غلط"

"اچھا تم بتاؤ"

"گرین لینڈ۔ رقبہ 840000 مربع میل۔ حوالہ کے لیے دیکھیے معلومات کا انسائیکلو پیڈیا صفحہ 15"

منّا فتح یابی کے ڈنکے بجاتا ہوا باہر چلا گیا۔ ہم سوچنے لگے آج ساری شیخی کر کری ہوگئی۔ چاروں سوالوں میں سے ایک کا بھی صحیح جواب نہ دے سکے۔ چند دنوں کے بعد ہم دوستوں کو بر سبیل تذکرہ بتا رہے تھے کہ نپولین نے ایک بار کہا تھا "واٹر لو کی جنگ ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی۔"

بدقسمتی سے منّے نے ہماری بات سن لی اور فوراً اس کی تردید کرنے کے لیے کمرے میں آ دھمکا "معاف کیجئے ڈیڈی، یہ قول نپولین کا نہیں اس کے فاتح ڈیوک آف ولنگڈن کا ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے معلومات کا انسائیکلو پیڈیا صفحہ 24۔"

ہمارے دوستوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور ہم پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چند دنوں کے بعد ہمیں منّے کے ہیڈ ماسٹر کی طرف سے ایک خط ملا، لکھا تھا:

"جناب من!

آپ کے منّے نے دن رات اپنے اسکول کے ماسٹروں سے عجیب و غریب سوالات پوچھ پوچھ کر ان کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ان میں سے دو ایک نے تو دھمکی دی ہے کہ اگر منّے کو نہ روکا گیا تو وہ ملازمت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ براہِ کرم منّے کو سمجھائیے کہ وہ اپنے استادوں پر رحم کرے۔"

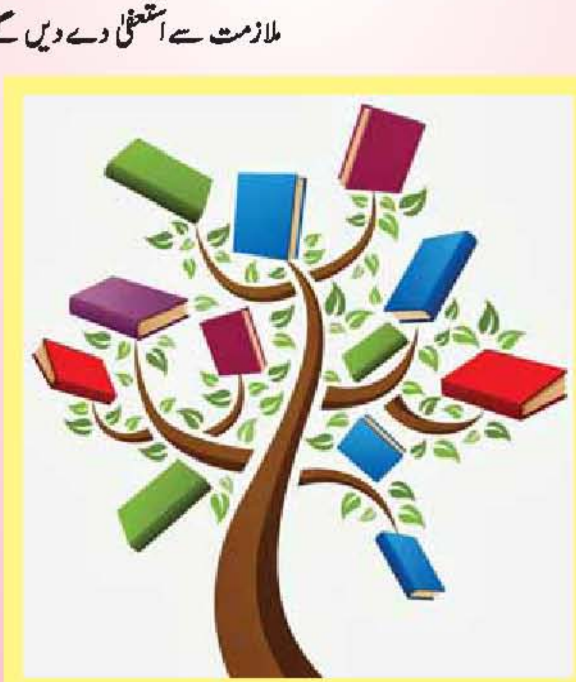

ہم نے منّے کو بلا کر پوچھ گچھ کی تو اس نے اپنی صفائی میں کہا "ڈیڈی، ہمارے ماسٹروں کو تو کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ بے چارے تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہیلیم Helium کس لیے استعمال کی جاتی ہے اور اسٹیتھسکوپ کس نے ایجاد کی تھی۔"

"یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں" ہم نے کہا۔

"واہ! آپ اتنا بھی نہیں

جانتے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہیلیم ایک ہلکی سی گیس ہے جسے مریض کو بے ہوش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اسٹیتھسکوپ ریئی تھیوفائل لینک نے ایجاد کیا تھا“

”بہرحال تمھیں ایسے سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“

”ضرورت کیوں نہیں جب ماسٹر صاحب کو ہمارا امتحان لینے کا حق ہے تو ہمیں بھی ان کا امتحان لینے کا حق ملنا چاہیے“

بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ ماسٹر صاحبان ایسی باتیں پسند نہیں کرتے آئندہ تم جو سوال بھی چاہو، ہم سے پوچھ سکتے ہو۔ کہنے کو تو ہم نے کہہ دیا۔ لیکن اچھی خاصی مصیبت مول لے لی۔ اب منا روز ہم سے جرح کرنے لگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ فلاں ملک کا رقبہ کتنا ہے۔ چاند زمین سے کتنی دور ہے۔ چاند گرہن کیوں لگتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ شروع میں ہم نے اس کے سوالوں کے غلط جوابات دینے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس نے ہمارے ہر جواب کا مذاق اڑایا تو ہم نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ مثال کے طور پر منے نے پوچھا۔

”دنیا کی کل آبادی کتنی ہے؟“

”ہمیں معلوم نہیں کوئی اور سوال پوچھو“

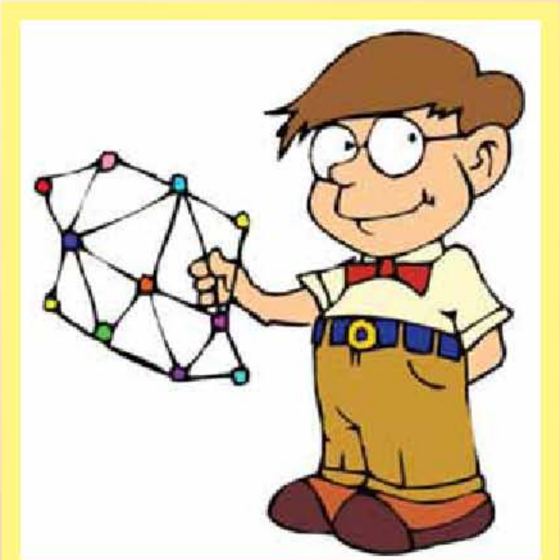

”دنیا کی سب سے بڑی جھیل کا کیا نام ہے؟“

”خدا جانے کیا ہے، کوئی اور سوال پوچھو“

”عمر خیام ارسطو سے کتنے سال بعد پیدا ہوا تھا؟“

”معلوم نہیں۔ اگلا سوال پوچھو“

”قطب الدین ایبک کو ایبک کیوں کہتے ہیں؟“

”یہ بھی معلوم نہیں، کوئی اور سوال پوچھو“

”بائی سیلی کون تھا؟“

”کوئی ہوگا۔ اگلا سوال پوچھو“

”پولینڈ کا دارالخلافہ بتایئے“

”پولینڈ کا دارالخلافہ ہے... وہ یعنی... اچھا اب جاؤ پڑھو لکھو، باقی سوال کل پوچھ لینا۔“

ہم نے سمجھا کہ یہ چال چل کر ہم نے منے کو لاجواب کر دیا ہے۔ لیکن ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب ہم نے منے کو ایک دن اپنے دوستوں سے یہ کہتے ہوئے سنا ”صاحب عجیب مصیبت ہے، کوئی کرے تو کیا کرے۔ علمیت کا تو گویا جنازہ ہی نکل گیا ہے والدین تو والدین ماسٹر صاحبان بھی کچھ نہیں جانتے۔ اب کوئی کس سے تعلیم حاصل کرے۔ پڑھانے والے ہی لد گئے۔“

□□

کامکس
اسٹوری

بھولے بھالو
کی حماقتیں

مشن: ٹی وی اینٹینا!

بالکل! دنیا میں کوئی کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا انٹینا لگانا!... بشرطیکہ کوئی لگاتے وقت اسے گرا نہ دے!
تمھیں پتہ بھی ہے یہ کیسے لگتا ہے؟
فکر مت کرو بھولے بھائی! تمھارے ایک دو تین کہنے سے پہلے ہی میں اسے کھڑا کر دوں گا
اوکے! پانچ ڈالر بچانے کے لیے میں تمھارا شکرگزار رہوں گا!
آدھے گھنٹے بعد
لو بھئی لگ گیا! ٹھیک ہے؟
ایک بات چھوڑ کر باقی سب کچھ ٹھیک ہے!؟
وہ کیا؟
تم نے انٹینا گھر کی بجائے گیراج پر لگا دیا ہے
کوئی بات نہیں۔ فکر نہ کرو۔ ذرا سی دیر میں اسے وہاں لگا دوں گا
ٹھیک ہے!
اچھا ہوتا جو سروس والے کو بلا لیتا۔ چنکو سے تو ڈر لگتا ہے کہیں ٹیلی ویژن ہی نہ برباد کر دے
یہ کیا؟ ارے واہ... چنکو نے تو کمال کر دیا۔ ٹیلی ویژن کام کرنے لگا

چنکو کی تعریف کرنی چاہیے۔ کتنی صاف سیدھی تصویر آرہی ہے۔ میں اس پاجامے کا ایک ایک دھاگا صاف دیکھ سکتا ہوں
آدھے گھنٹے بعد
یہ کیا؟ یہ تو دنیا سب سے لمبا ٹی وی سیریل لگتا ہے۔ دیکھتے ہیں دوسری چینل پر کیا آرہا ہے؟
یہ کیا مذاق ہے؟ ہر چینل پر یہی آرہا ہے؟ میرا خیال ہے یہ بات چنکو کو بتانی چاہیے...
اوہو یہ بات ہے! اینٹینا کپڑوں کے بالکل سامنے لگ گیا ہے!
اوفوہ! تو مجھ سے یہ فطری غلطی ہوئی ہے!
حد ہوگئی! چلو ہٹو میں سروس مین کو بلا رہا ہوں!
نہیں نہیں، ٹھہرو بھولے بھائی اتنی جلدی نہ مچاؤ!
میں تمھارا سب کام ٹھیک کردوں گا۔ آخر تمھارے پانچ ڈالر بھی تو بچانے ہیں!
اچھا...!؟
...ٹھیک ہے، لیکن یہ سب ٹھیک سے کرنا!
ارے نہیں۔ اس مرتبہ سب کچھ ٹھیک ہوگا

ارے ارے...
سنبھل کر چکو...
ہائے میرا خوب صورت اینٹینا!
تم خوش قسمت ہو بھولے! پورے جنگل ٹاؤن میں اتنا ماڈرن ٹائپ اینٹینا کسی کا نہیں ہوگا
ایں!؟
اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی۔ تھوڑا سا ٹیڑھا میڑھا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا
کاش یہی بات میں تمھاری کھوپڑی کے بارے میں کہہ سکتا
اوکے! اب ٹی وی چلا سکتے ہو بھولے!
ٹھیک ہے! اب اور انتظار نہیں ہوتا!
اف! دیکھو مڑا تڑا اینٹینا کیسی تصویر دکھا رہا ہے
ارے...!؟
میرا خیال ہے اسے پیچھے سے ایڈجسٹ کر کے سیدھا کیا جا سکتا ہے
اور میرا خیال ہے اسی میں تمھاری خیریت ہے!

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

مقصود شیخ

اک تھا بچپن...

میں نے پڑھنا کیسے سیکھا

میں آپ کو ایک دلچسپ بات سچی سچی بتاتا ہوں۔ میں تو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ظاہر ہے لاڈلا اور بگڑا ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ابا اور بڑے بھائی سبھی اونچے عہدوں پر سرکاری ملازم تھے۔ اس وجہ سے اکثر ان کا تبادلہ ہوتا اور ہم کبھی دہلی، کبھی شملہ میں ہوتے۔ اپنے وطن گجرات بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ یہی ایک ایسی وجہ تھی جس کی بنا پر میں دیر سے کسی اسکول میں تعلیم یعنی پڑھنے کی غرض سے داخل ہوا۔ ہمارے گھر میں سب بہن بھائیوں کو رسالے کتابیں پڑھنے اور لکھنے کا شوق تھا۔ یہ شوق کیا تھا ایک 'عارضہ' تھا۔ خاموش ماحول میں، میں اِدھر سے اُدھر جاتا اور نہایت پیار سے بھگا دیا جاتا کہ ہم پڑھ رہے ہیں۔ میری رضیہ بہن کو، جو ادبی دنیا میں بیگم رضیہ محمد اختر کے نام سے عورتوں کے ادبی حلقوں میں جانی گئیں، مجھ پر ترس آتا۔ وہ اباجی سے کہا کرتیں کہ اگر اسکول نہیں تو مقصود کے لیے کوئی ماسٹر گھر پر رکھ دیجیے۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں ان کو پاس بیٹھے رہنے کے لیے کہتا کہ جو آپ پڑھ رہی ہیں مجھے بھی سنائیے۔ جواب ملتا یہ بچوں کے لیے نہیں ہے۔ اس کی تلافی وہ یوں کرتیں کہ رات کو سونے سے پہلے کہانی سناتیں۔ ایسا کم ہوتا کہ ان کی یہ ذمہ داری بھی اللہ بخشے اماں جی اٹھا لیتیں تاکہ بیٹی نیند پوری کر لے۔ خیر،، میری خوش قسمتی سے ایک بار شور پڑا کہ میرے نام ڈاک میں کچھ آیا ہے۔ یہ ایک رسالہ تھا لیکن مجھے تو پڑھنا نہیں آتا تھا۔ بس یہ معلوم ہوا کہ ہمارے منجھلے بھائی جان مقبول الٰہی نے میری سالگرہ کے تحفہ کے طور پر میرے نام ایک بچوں کا رسالہ 'پھول' جاری کرایا تھا۔ مقبول الٰہی بھی بعد میں انگریزی اردو کے بڑے رائٹر اور مصنف بنے۔ دوسرے دو بھائی بھی لکھتے تھے۔ خیر، میں سوچ رہا تھا بھائی جان شملہ میں، میں گجرات میں اور 'پھول' لاہور سے! عجیب تکڑم یا تکون بنی۔ لیکن مجھے تو پڑھنا نہیں آتا تھا۔ رضیہ آپی کو پھر ترس آیا مجھے رسالہ ریپر سے نکالنا سکھایا اور پھر کہا پڑھو! میں رو ہی دیا۔ رضیہ آپی نے پہلے صفحہ پر رسالے کے نام پر انگلی رکھی اور کہا پھول کہہ لیتے ہو بول لیتے ہو اب پڑھ بھی لو۔ اس طرح انہوں نے مجھے حرف شناسی سکھائی۔ ایک ایک لفظ ذہن نشین کرایا۔ الف بے پے کی جگہ میں پورا پورا لفظ پڑھنے لگا، وقت لگا۔ پسینے چھوٹ گئے مگر آپی کو رحم نہ آیا۔ میں سوچتا اچھا لاڈلا ہوں۔ غرض یہ پہلا لفظ پھول تھا جو میں پڑھنا سیکھا۔

لمبے تعلیمی سفر کا یہ پہلا قدم مشکل مگر دلچسپ تھا.... ہے نا؟

تو میں نے ہولے ہولے دھیرے دھیرے پڑھنا شروع کیا۔ لکھنا بھی اسی طرح آ گیا۔ جو لفظ پڑھتا اسے نقل کرتا جس کا ثمر یا انعام یہ ملا کہ میں اسکول میں گیا تو اپنی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت اور قابلیت پر ایک دم تیسری یا چوتھی جماعت میں داخلہ مل گیا۔ اب میں اپنے ہم عمروں سے پیچھے نہ رہا مگر یہاں بھی محنت کر کے ہی اپنے ساتھیوں کے برابر یعنی ہم قدم ہو سکا۔ یہ گر مجھے بچپن سے معلوم ہو گیا کہ انسان دلچسپی

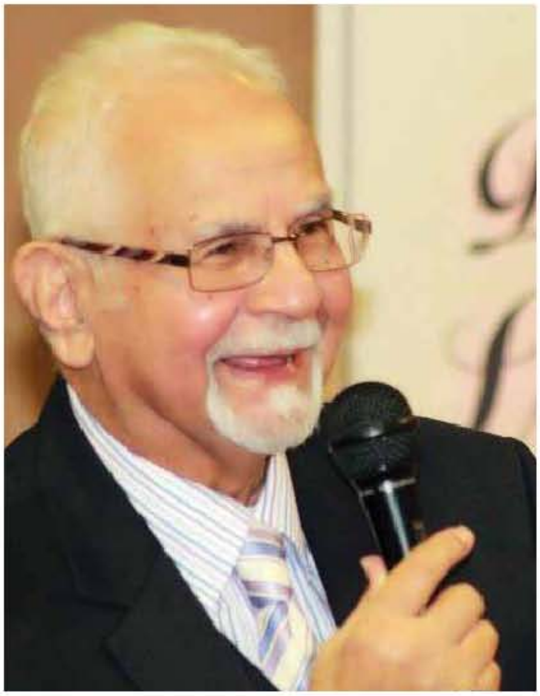

بچّو ،مقصود شیخ، جن کا پورا نام مقصود الٰہی شیخ ہے، اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ادب کے صحافی ہیں۔ ان کے افسانوں کے بارہ مجموعے چھپ چکے ہیں اور دنیا کے بڑے اداروں نے انھیں کئی ایوارڈ دیے ہیں۔ مقصود صاحب بریڈفورڈ انگلینڈ میں رہتے ہیں۔انگلینڈ میں انھوں نے 'راوی ایشین ویکلی' کے نام سے ایک اردو ہفتہ وار رسالہ جاری کیا جس نے برطانیہ میں بڑی شہرت پائی۔ وہ اب خاصے بزرگ ہو چکے ہیں لیکن اس عمر میں بھی خوب کام کرتے ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' انھیں پسند آیا ہے چنانچہ ہماری درخواست پر انھوں نے آپ کے لیے اپنے بچپن کی کچھ دل چسپ یادیں لکھ بھیجی ہیں۔ پڑھیے اور لطف لیجیے۔ہم کوشش کریں گے اردو کے مشہور اور بزرگ ادیبوں سے ان کے بچپن کی یادیں لکھوائیں تاکہ انھیں پڑھ کر ہم سبھی کو بہتر انسان بننے کی ترغیب ملے۔اس سلسلے میں آپ بھی اپنی فرمائش ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ادارہ

پیدا کر کے ہمت سے اور محنت سے کام لے تو اس کے سامنے کوئی دشواری اور رکاوٹ نہیں ٹکتی بلکہ ڈھیر ہو جاتی ہے۔آپ یقین کریں کہ میں بھی اپنے بہن بھائیوں کی طرح رسالوں میں...بچوں کے رسالوں میں چھپنے لگا۔رسالے میں اپنا نام دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی۔ میرا سب سے پہلا مضمون دہلی کے ایک رسالے 'بچوں کا باغ' میں چھپا۔اس کی

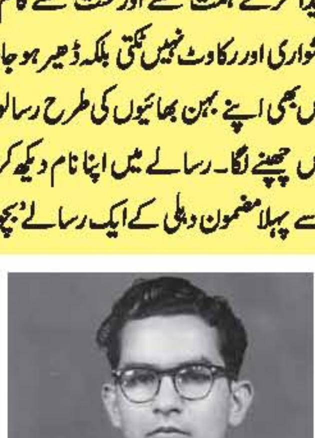

ایڈیٹر رضیہ سلطانہ چمن اور ان کے شوہر محمد رحیم دہلوی تھے۔ میں نے رضیہ آپی اور رضیہ سلطانہ چمن کی قلمی دوستی کرادی۔ یہ بھی میری عادت ثانیہ بن گئی۔ میں دوست بنانے اور دوسروں سے ملانے لگا۔ یہاں تک کہ ساری عمر قلم کاروں کے درمیان پل ہی بناتا رہا۔وہ یوں کہ ہندوستانی اور پاکستانی رائٹرز کے افسانے مضامین اپنے اخبار رسالے میں شائع کرتا اور ایک دوسرے سے رائے زنی کرایا کرتا۔

تو میرے ننھے منے دوستو! اب تک میں کئی کتابیں لکھ چکا ہوں۔ لکھنا پڑھنا بہت اچھی بات ہے۔ جب لکھنا آجاتا ہے تو سمجھو پڑھنے سے زیادہ اونچا درجہ مل گیا۔ جب آپ نے اپنے دل کی بات لکھ کر دوسروں تک پہنچادی تو پھر کیسے آپ کا نام نہیں ہوگا۔ میں نے اپنے ہفت روزہ راوی میں جہاں اردو بولو، اردو پڑھو، اردو لکھو کی تحریک چلائی وہیں یہ سلوگن بھی گھڑا: دل میں نہ رکھو راوی میں لکھو۔ اچھے خیالات کے اظہار سے آپ نیک نام ہوں گے۔ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا کر ان کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے، اپنے ساتھ ملا سکیں گے۔ روشنی پھیلا سکیں گے۔ میرا پیغام ہے بچو! جو بولو وہ پڑھو اور لکھو۔ دوسرں تک پہنچاؤ، اور پھیلاؤ۔

□□

قسط وار داستان

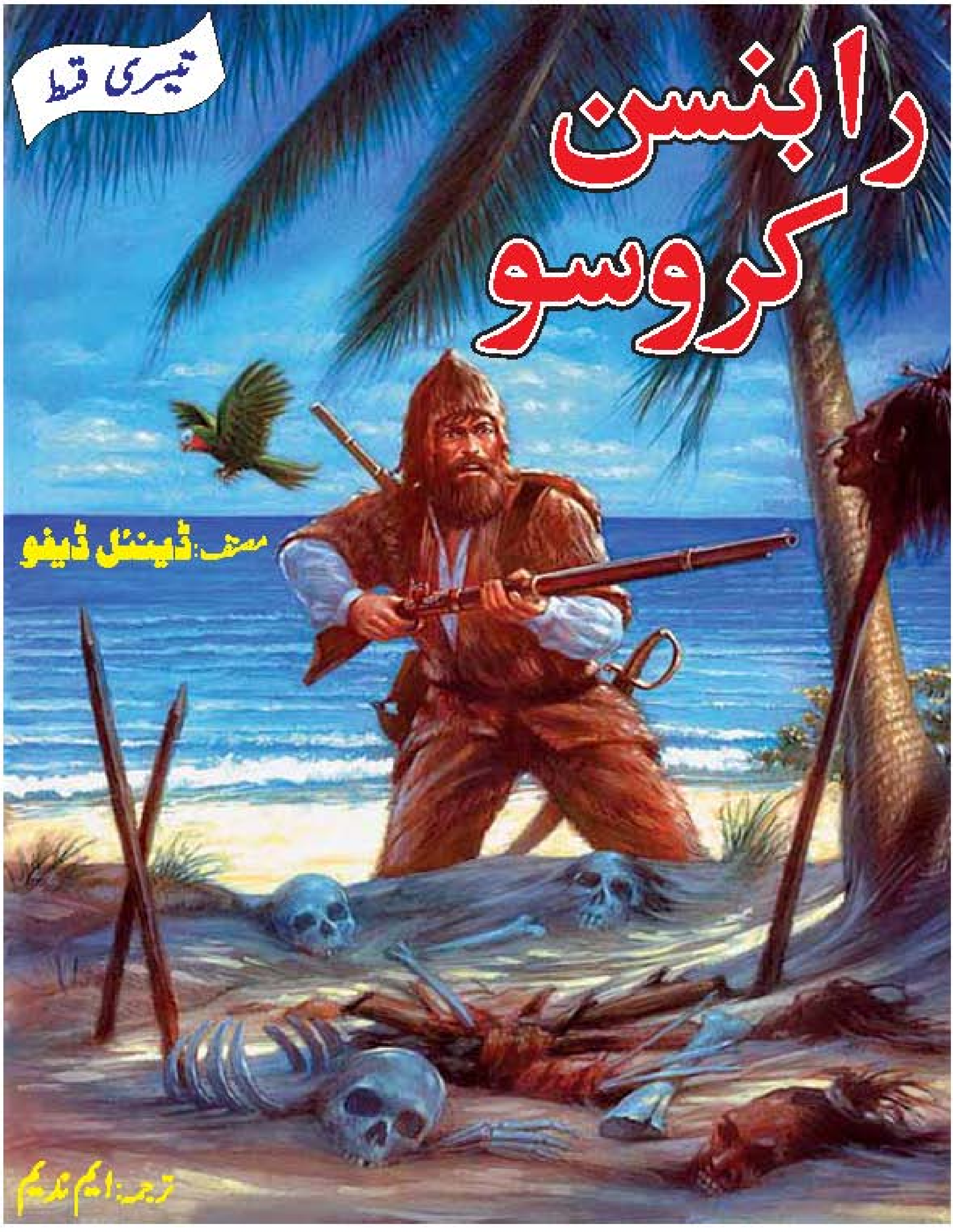

تیسری قسط

رابنسن کروسو

مصنف: ڈینئل ڈیفو

ترجمہ: ایم ندیم

'رابنسن کروسو' انگریزی مصنف ڈینیل ڈیفو Daniel Defoe کا لکھا ہوا مشہور ناول ہے جو سب سے پہلے 25 اپریل 1719 کو چھپا تھا۔ مصنف کا نام اس میں رابنسن کروسو دیا گیا تھا جب کہ اصل میں یہ ڈیفو کے ناول کا خیالی اور مرکزی کردار تھا جو اپنی زندگی کے حیرت انگیز واقعات کو سچا بتا کر اپنی داستان سناتا ہے۔ کتاب کا اصل نام کافی طویل تھا:

The Life and Strange Surprizing Adventures of Robinson Crusoe, Of York Mariner: Who lived Eight and Twenty Years, all alone in an un-inhabited Island on the Coast of America, near the Mouth of the Great River of Oroonoque; Having been cast on Shore by Shipwreck, wherein all the Men perished but himself. With An Account how he was at last as strangely deliver'd by Pyrates

پڑھنے والوں نے اسے سچی کہانی سمجھا لیکن یہ تمام تر خیالی قصوں کا مجموعہ تھا۔ بنیادی کہانی اسکاٹ لینڈ کے باشندے الیکزینڈر سیلکرک Alexander Selkirk کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی جو 1676 میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے وقت کا مشہور ملاح تھا اور سمندر میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی سے متاثر ہو کر تشکیل دیے گئے کردار رابنسن کروسو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ 1966 میں بحرالکاہل کے اُس جزیرے 'ماسا تیرا' کا نام رابنسن کروسو رکھ دیا گیا جہاں سیلکرک چار سال تک رہا تھا۔ کتاب کا مصنف ڈینیل ڈیفو 1960 میں لندن میں پیدا ہوا اور 24 اپریل 1731 کو اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بیک وقت ایک تاجر، مصنف، صحافی اور جاسوس تھا۔ وہ ان مصنفوں میں شامل ہے جنھوں نے انگریزی میں ناولوں کی شروعات کی تھی۔ انگریزی ادب کے بہت سے جانکار 'رابنسن کروسو' کو انگریزی زبان کا پہلا ناول مانتے ہیں۔ ڈیفو بڑا ہی زود نویس مصنف تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں، ناول، رسالے، کتابچے وغیرہ لکھے جن کی تعداد 500 سے زیادہ ہے اور جرائم، نفسیات، سیاست، مذہب، جنتر منتر اور شادی بیاہ اس کی تحریروں کے چند موضوعات ہیں۔ ناول 'رابنسن کروسو' اس کی سب سے مشہور تصنیف ثابت ہوا جس پر کئی فلمیں بن چکی ہیں، دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور بے شمار کامکس اسٹرپ بنائے جا چکے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے پہلی بار 1978 میں اس کی تلخیص اردو میں شائع کی جس کا ترجمہ جناب ایم ندیم نے کیا تھا۔ آیئے اس دل چسپ اور حیرت انگیز واقعات سے بھری ہوئی داستان کا قسط وار مطالعہ کرتے ہیں۔ اعزازی مدیر

ڈینیل ڈیفو

اب تک آپ نے پڑھا: رابنسن کروسو اپنی کہانی سناتے ہوئے بتاتا ہے کہ وہ یارک شہر میں 1632 کو ایک دولت مند تاجر کے گھر میں پیدا ہوا۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے باپ کا بڑا لاڈ پیار ملا۔ رابنسن بڑے ہو کر دنیا کی سیر کرنا چاہتا تھا لیکن والد کو یہ منظور نہ تھا۔ انھوں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلائی لیکن دنیا بھر میں گھومنے کی اجازت نہیں دی۔ مگر ایک دن وہ بچپن کے ایک دوست کے ساتھ دنیا کے سفر پر نکل پڑا جو اپنے والد کے ساتھ سمندری جہاز سے لندن جا رہا تھا۔ لیکن یکم ستمبر 1651 کو سفر کے پہلے ہی دن سے منحوس واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاز روانہ ہوتے ہی سمندری طوفان آگیا اور رابنسن اپنی زندگی سے مایوس ہو کر پچھتانے لگا کہ والدین کا کہنا نہ مان کر اس نے سخت غلطی کی ہے۔ یہ طوفان گزر گیا لیکن راستے میں پھر ایک طوفان آیا جس میں ان کا جہاز ڈوب گیا۔ وہ اور جہاز کے لوگ جان بچا کر مشکل سے یارمتھ شہر کے ساحل پر پہنچے۔ اس کے دوست کے باپ نے کہا کہ یہ سب

رابنسن کی نحوست سے ہورہا ہے جو اپنے بیمار والد کی اجازت لیے بغیر اس سفر پر آیا ہے۔ رابنسن یہ سننے کے بعد واپس گھر چلے جانا چاہتا تھا لیکن اسے باپ کا سامنا کرتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ آخر وہ لندن پہنچا جہاں ایک سمندری تاجر نے اسے دوست بنا لیا ۔ والد نے کچھ رقم رابنسن کے پاس لندن بھجوادی تھی جس سے اس نے سمندری سفر کا سامان خرید لیا۔ تاجر دوست کے ساتھ وہ گنی کے سفر پر گیا اور خوب منافع کے ساتھ بہت سا سونا جمع کرکے لندن واپس آیا۔لیکن یہاں اس کا دوست بیمار ہوکر مرگیا ۔ اس نے منافع کا بہت سا حصہ دوست کی بیوہ کے پاس رکھا اور گنی کے ایک اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ اس بار وہ اور اس کے ساتھی جہازی لٹیروں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ایک لٹیرے نے رابنسن کو اپنا غلام بنا لیا۔ مگر کچھ دن بعد رابنس شکار کے بہانے اس لٹیرے کے چنگل سے بچ نکلا۔ سمندر میں ایک جہاز کے نیک دل کپتان نے اس کی مدد کی اور وہ تجارتی سفر پر اسے اپنے ساتھ برازیل لے گیا۔ وہ چار سال برازیل رہا ۔ وہاں وہ ایک شوگر فیکٹری بھی کھولنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت تھی اس لیے لندن سے اپنے مرحوم تاجر دوست کی بیوہ سے اس نے اپنی جمع شدہ رقم میں سے ایک ہزار پونڈ کے عوض بہت سا سامان منگوا لیا۔اس نے گنّے اور تمباکو کی کھیتی کے گر بھی سیکھ لیے۔مگر اب وہ بے حد دولت مند بننے کے لالچ میں پڑگیا جس کا اسے بے حد نقصان اٹھا نا پڑا۔ ایک روز تین تاجروں نے آکر اسے لوگوں کو غلام بنا کر بیچنے کا دھندا کرنے کی صلاح دی اور کہا کہ گنی سے بہت سے غلام مل سکتے ہیں جنہیں بیچ کر خوب دولت کمائی جاسکتی ہے۔ وہ ان کی باتوں میں آگیا اور نیک دل کپتان دوست کو لے کر سمندری سفر پر نکل پڑا۔ اس بار بھی سفر کی تاریخ یکم ستمبر تھی اور سال 1659 کا تھاجس سے آٹھ سال پہلے وہ زندگی کے پہلے سمندری سفر پر نکلا تھا ۔ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دوھرایا اور کیریبیائی ملکوں کے درمیان طوفان سے ان کے جہاز کو کافی نقصان پہنچا ۔ ایک دن ان کا جہاز ری‌ت میں دھنس گیا اور جان بچانے والی کشتی بھی الٹ گئی۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں نے رابنسن کو ساحل پر لا پٹکا۔یہ ایک ویران جزیرے کا ساحل تھا۔رابنسن کی جان تو بچ گئی مگر جہاز تباہ ہو گیا تھاجو سمندر میں ایک چٹان کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ کسی طرح جہاز پر پہنچا ۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے سبھی ساتھی مر چکے تھے ۔ جہاز سے وہ بہت سا کھانے پینے سامان گولہ بارود سونا چاندی نقدی اور دوسری بہت سی چیزیں ساحل پر لے آیا۔ چند روز بعد اس نے دیکھا تو جہاز غائب تھا۔ سمندری ہوا اسے بہا کر لے گئی تھی۔ کروسو جزیرے پر اکیلا رہ گیا۔ بس ایک کتا اور دو بلّیاں اس کے ساتھ تھیں جو وہ جہاز سے لایا تھا۔ اس نے بڑی محنت سے جزیرے پر اپنا گھر بنایا۔ میز کرسی تیار کی۔ جہاز سے مرغیوں کا جو دانہ ساتھ لایا تھا اور اس دانے سے فصل اگانے کی کوشش شروع کردی۔ جب اسے جزیرے پر دس مہینے ہو گئے ۔ ایک دن وہ پورے جزیرے کی سیر کے لیے نکل پڑا۔ اب آگے پڑھیے۔

میں ایک پہاڑی پر گیا، اس پر طرح طرح کے میوہ دار پیڑ تھے۔ اس کے علاوہ ککڑیاں، پھوٹ اور خربوزے وغیرہ زمین پر بچھے پڑے تھے۔ انگور کی شاخوں میں گچھے لٹک رہے تھے۔ انگور پاکر میرا دل بہت خوش ہوا۔ میں نے احتیاط سے کھائے کیونکہ زیادہ کھانے سے بخار آجاتا ہے۔ میں نے بہت سارے انگور توڑ کر دھوپ میں سکھائے اور منقی بنا لیے۔ اس کے آگے اور بھی اچھی جگہ تھی، میں نے یہاں سے لیموتوڑے۔ لیموکا عرق پانی میں ملا کر پینے سے پانی بہت ذائقہ دار لگا۔

دوسری بار میں تھیلی لے کر گیا اور بہت سارے لیمو توڑ لایا۔ انگوروں کے گچھے محفوظ کرنے کے لیے میں نے ان پر تھیلیاں چڑھادیں۔ یہ جگہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے ایک بار تو یہ فیصلہ کیا کہ میں یہیں پر گھر بنا کر رہوں اور سارا سامان اٹھالاؤں۔ لیکن جب غور کیا تو میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ میرا پہلے والا مکان سب سے مناسب جگہ پر ہے۔ اگر قسمت نے میرا ساتھ دیا تو میری رہائی کا دارومدار سمندر سے ہی وابستہ ہے اور سمندر کے قریب رہنے ہی سے مجھے یہ موقع مل سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے نئی جگہ مکان بنانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ لیکن چونکہ میرا دل اس جگہ پر خوب لگتا تھا اس لیے میں کبھی کبھی یہاں پر آجایا کرتا تھا اور دو چار دن رہ جاتا تھا۔ میں نے ایک درخت پر مچان بنالی تھی۔ اور رات کو اسی پر سوجایا کرتا تھا۔ اس طرح میرے پاس دو مکان تھے۔ ایک سمندر کے کنارے والا اور دوسرا جنگل میں۔

30 ستمبر کو مجھے اس جزیرہ میں آئے ہوئے پورا ایک سال بیت گیا تھا، اس تاریخ کو میں ہر سال روزہ رکھا کرتا تھا۔

بارش میں، میں نے دھان اور جو بوئے، کھیت تیار کرنے کے لیے زمین کو ملائم کیا۔ کھیت کے دو حصے کیے، ایک میں دھان اور دوسرے میں جو بوئے۔ لیکن ایک مٹھی دھان اور جو میں نے بچا کر رکھ لیے۔ دھان اور جو کی فصل بارش نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہوگئی۔ بچے ہوئے جو اور دھان میں نے فروری کے مہینے میں بوئے۔ مارچ اور اپریل کی بارش کا پانی پی پی کر دھان اور جو کے پودے بڑھ گئے اور بڑی امیدوں کے بعد جب فصل تیار ہوئی تو تقریباً آدھ پاؤ یا کچھ زیادہ اناج دست یاب ہوا۔ میرا یہ پہلا تجربہ تھا اور کامیاب رہا تھا۔ اس لیے میں نے اگلے سال دو فصلیں اگانے کا فیصلہ کیا۔

گھر کے چاروں طرف میں نے لکڑی کی شاخیں کاٹ کر گھیرے کی صورت میں گاڑ دی تھیں۔ برسات میں ان میں نئی شاخیں پھوٹیں اور دو تین سال کے عرصہ میں وہ بڑے بڑے درختوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ میں نے اسی قسم کا ایک اور گھیرا تیار کیا اور اس طرح یہ گھیرا دوہرا ہوگیا اور خوب سایہ دار بن گیا۔ گرمیوں کے موسم میں سایہ اور

ٹھنڈک رہنے لگی۔ میرا مکان ایک محفوظ اور سایہ دار پناہ بن گیا۔

مجھے یہاں کے موسموں کا اب اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ سال میں چار موسم ہوتے تھے۔ چونکہ برسات کے موسم میں بخار اور جسم میں درد کی شکایت رہتی تھی اس لیے برسات کا موسم بہت احتیاط کے ساتھ گزارتا تھا۔ میں ضرورت کی تمام چیزیں برسات کے شروع ہونے سے پہلے ہی اکٹھا کرلیتا تھا۔

مجھے غلہ رکھنے اور مٹی پھینکنے کے لیے ٹوکروں کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک درخت کی چھوٹی چھوٹی شاخیں کاٹیں۔ لیکن جب میں نے ان شاخوں کو ڈلیا بنانے کے لیے موڑا تو وہ ٹوٹ گئیں۔ تب میں نے اپنے مکان کے گھیرے والے درختوں کی نرم نرم شاخوں سے ٹوکریاں بنانے کا ارادہ کیا۔ گو اس سے پہلے میں نے ٹوکری بنانے کا باقاعدہ کام نہیں سیکھا تھا، لیکن بچپن میں اپنے پڑوسی کے یہاں یہ کام ہوتے ہوئے دیکھا ضرور تھا۔ میں کبھی کبھی یونہی کھیل کھیل میں اپنے ہمسایہ کا ہاتھ ڈلیا بنانے میں بٹاتا تھا۔ خوش قسمتی سے بچپن کا وہ ہاتھ بٹانا میرے کام آگیا۔ اب میرے پاس چھوٹی بڑی کئی ڈلیاں تھیں۔ ان ٹوکریوں میں ہر قسم کا سامان رکھتا تھا اور ان ہی سے مٹی پھینکنے کا کام بھی لیتا تھا۔ جب غلہ زیادہ ہونے لگا، تو میں ان کو تھیلیوں کے بجائے ٹوکریوں میں ہی رکھا کرتا تھا۔ جب بھی کوئی ٹوکری ٹوٹتی تو میں نئی بنالیا کرتا تھا۔

میں نے ایک طوطا پالا تھا، وہ میرا نام رٹا کرتا تھا، یہ طوطا بہت دنوں تک زندہ رہا۔

میں روزانہ بندوق اور چھرہ بارود لے کر جنگل میں نکل جاتا تھا۔ میرے ساتھ میرا کتا بھی ہوتا تھا۔ تھیلے میں تھوڑے سے منقے بھی رکھ لیتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں دور نکل جاتا اور رات کسی پیڑ پر بسر کرتا، اور کئی دن کے بعد گھر واپس آتا۔ اس طرح میں نے گھوم پھر کر سارے جزیرے کو دیکھ لیا تھا۔ میرے جزیرے سے بیس پچیس میل کے فاصلہ پر ایک اور جزیرہ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ امریکہ کا ہی کوئی حصہ ہے جہاں آدم خوروں کی بستیاں ہیں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ میرا جہاز اس جزیرہ ہی میں تباہ ہوا، اگر میں دوسرے جزیرے میں جا پھنستا تو آدم خور نہ جانے کب کا مجھے اپنا نوالہ بنا چکے ہوتے۔

ایک بار میں نے ایک بکری کا بچہ جنگل سے پکڑا۔ وہ رفتہ رفتہ مجھ سے مانوس ہوگیا۔ میرے ہاتھ سے چارہ کھاتا تھا اور میرے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب میں بہت ساری بکریاں پالوں گا۔

میں نے جو ایک طوطے کا بچہ پالا تھا وہ بھی اب بڑا ہوگیا تھا۔ میں خالی وقت میں اس کو پڑھایا کرتا تھا۔ یہ طوطا خوب بولتا تھا۔ میں گھر کے ایک فرد کی طرح سے اس سے محبت کرتا تھا۔ میں نے طوطے کے لیے

ایک پنجرہ بھی تیار کیا تھا۔

میں جب بہت رنجیدہ ہوتا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو لیتا تھا اور اس طرح دل کو بوجھ ہلکا کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا۔ میں کبھی کبھی انجیل مقدس نکال کر اس کی تلاوت بھی کیا کرتا اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا تھا کہ وہ مجھے اس تنہائی کی قید سے نجات دلائے۔

اب مجھے اس جزیرے میں رہتے ہوئے دو سال بیت گئے تھے اور تیسرا سال شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے وقت کو تقسیم کر لیا تھا۔ سب سے پہلے تو میں انجیل مقدس کی تلاوت کرتا تھا۔ اس کے بعد شکار کو نکل جاتا تھا اور جو شکار ملتا اس کو پکاتا اور کھانا کھاتا۔ دوپہر کے وقت گرمی بہت ہوتی تھی اس وجہ سے یہ وقت میں گھر پر ہی گزارتا تھا۔ کبھی کبھی دوپہر کے بعد شکار کو نکلتا۔ گھر پر بھی کام کرتا۔ فالتو وقت میں طوطے کو پڑھایا کرتا۔ اوزاروں کی کمی ہونے کی وجہ سے اور کوئی دوسرا مددگار نہ ہونے سے چھوٹے چھوٹے کاموں میں وقت بہت لگتا تھا۔ مثلاً اپنے مکان میں مجھے ایک لکڑی کی الماری بنانی تھی۔ لکڑی کے تختے بنانے اور لگانے میں مجھے ایک مہینہ لگ گیا۔

میں نے غلہ اگانے کے لیے زمین تیار کی۔ مینڈھ باندھی، کدال ٹھیک کی، ہل کا کام میں نے لکڑی سے لیا۔ یہاں پر ایک قسم کا درخت ہوتا ہے جس کو برازیل کے لوگ لوہا لکڑی کہتے ہیں۔ اس کی لکڑی بہت بھاری اور مضبوط ہوتی ہے میں نے اسی لکڑی کا ہل بنایا تھا۔

دھان اور جو کے کھیت تیار ہونے پر میں نے فصل بو دی اور بارش میں ان کے انکھوے نکلنا شروع ہوئے۔ مجھے امید تھی کہ اس مرتبہ فصل بہت اچھی ہوگی۔ چوپایوں اور جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لیے میں نے اپنے کتے کو مقرر کر دیا تھا، وہ کھیت کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کئی جنگلی جانوروں کو میں نے بندوق سے مار بھی ڈالا تھا۔ لیکن خرگوش اور پرندے ہر وقت کھیت پر دھاوا بولتے رہتے تھے۔ میں نے کھیت کے لیے بہت محنت کی تھی اور بہت پسینہ بہایا تھا۔ چوپایوں سے تو میں نے کسی نہ کسی طرح کھیت کو بچا لیا تھا، لیکن پرندوں کی طرف سے مجھے بہت فکر رہتی تھی۔ خدا خدا کر کے فصل پکنے کا وقت آ گیا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ بہت سارے پرندے کھیت میں ہیں اور فصل کو برباد کر رہے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت قلق ہوا کہ موذیوں سے ایک دانہ بھی نہیں بچ سکے گا۔ میں نے تین چار پرندے گولی سے مارے اور انھیں الٹا کر کے کھیت کے بیچوں بیچ لٹکا دیا۔ اس کا اچھا نتیجہ نکلا اور ڈر کے مارے پھر کوئی پرندہ کھیت میں نہیں اترا۔

دسمبر کے آخر میں فصل کاٹنے کا وقت آیا۔ میں نے غلہ کاٹنے کا فیصلہ کیا لیکن میرے پاس فصل کاٹنے کے لیے ہنسیہ نہیں تھا۔ میں نے ایک تلوار توڑ کر ہنسیہ کا کام لیا۔ بالیوں کو توڑ توڑ کر ٹوکریوں میں بھر دیا۔ بہت سارا غلہ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب میرے پیٹ بھرنے کا انتظام ہو گیا۔

لیکن روٹی اور سالن تیار کرنے کے لیے مجھے کئی چیزوں کی ضرورت تھی۔ مثلاً آٹا تیار کرنے کے لیے چکی، آٹا چھاننے کے لیے چھلنی، روٹی بنانے کے لیے توا، نمک اور گھی وغیرہ چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ زمین کو جوتنے کے لیے لوہے کا ہل وغیرہ۔ لیکن میں نے اپنا کام چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لی تھی۔ اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔

مجھے برتنوں کی بھی سخت ضرورت تھی۔ اب تک میری سمجھ میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی کہ کس طرح بناؤں۔ آخر میں نے ایک دن برتن بنانے کا ارادہ کیا کیوں کہ بغیر برتنوں کے میرے لیے کام چلانا مشکل ہوگیا تھا۔ گرمی کا موسم تھا، مجھے ایک جگہ چکنی مٹی مل گئی۔ میں نے ایک گول سا برتن تیار کیا اور اسے دھوپ میں سکھا لیا۔ یہ بہت بھدا اور بھاری تھا، لیکن اس میں سوکھی چیزیں رکھی جا سکتی تھیں۔ اسی طرح میں نے بڑے بڑے برتن بنانے کی کوشش کی لیکن میری محنت اکثر بے کار ہو جاتی تھی۔ بعض برتن بنانے کے فوراً بعد ہی ٹوٹ جایا کرتے تھے۔ کبھی سوکھ کر بکھر جاتے۔ صرف ایک دو ہی استعمال کے قابل ہو پاتے تھے۔ ان برتنوں میں پانی یا شوربہ وغیرہ تو رکھا ہی نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی سالن پکایا جا سکتا تھا۔

میں نے سوچا کہ چھوٹی چھوٹی ہانڈیاں بناؤں اور ان کو آگ پر پکا لوں۔ اس طرح وہ پختہ ہو جائیں گی اور مضبوط بھی ہو جائیں گی۔

میں نے ایک بھٹی تیار کی جس میں کئی برتن پک سکیں۔ حالانکہ میں کمہاروں کے فن سے واقف نہ تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ وہ کس طرح برتنوں کو پکا کر ان پر سیسہ کرتے ہیں لیکن آگ میں پکانے کا عمل میرے ذہن میں تھا۔ میں نے چند ہانڈیاں اوپر تلے رکھ کر چاروں طرف سے آگ لگا دی اور دیکھتا رہا کہ زیادہ آگ اور آنچ سے وہ چٹخنے اور پھٹنے نہ پائیں۔ آخر کار میری محنت کام آئی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پانچ ہانڈیاں بالکل ٹھیک تیار ہوگئیں۔ البتہ ان میں سے ایک ضرور کچھ خراب ہوگئی تھی۔

اب مجھے جس طرح کی چھوٹی یا بڑی ہانڈی کی ضرورت ہوتی تھی بنا لیتا تھا۔ میرے پاس کمہاروں کا چاک نہیں تھا اس لیے میری بنائی ہوئی ہانڈیاں خوب صورت اور سڈول نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن ایسی بری بھی نہیں ہوتی تھیں۔ بہرحال میرا کام چل جاتا تھا۔ میں نے پہلی بار ہانڈی میں بکری کے گوشت کا شوربہ تیار کیا۔ نمک، مرچ نہ ہونے کی وجہ سے یہ شوربہ بہت لذیذ نہ تھا لیکن شوربہ تیار کر کے جب میں نے اسے پیا تو مجھے بڑا مزا آیا۔

آٹا پیسنے کے لیے چکی اور چھاننے کے لیے چھلنی کہاں سے آئے۔ میں نے بہت تلاش کیا کہ کوئی سخت پتھر مل جائے تو اس کی چکی بنانے کی کوشش کروں۔ لیکن اول تو مجھے کوئی ایسا مناسب پتھر نہ مل سکا جس کی چکی بن سکتی۔ اگر مل بھی جاتا تو اس کو کاٹنے اور

رندنے کی بھی مشکل تھی۔ میں نے لوہا لکڑی کی ایک اوکھلی بنائی اور اسی لکڑی کا موسل بنایا۔ اس اوکھلی میں ڈال کر جو کوٹ لیتا تھا۔ ایک درخت کی چھال کی جھلی سے میں نے اپنی چھلنی بنائی ۔ اب توا رہ گیا تھا۔ اس کی ترکیب یہ کی کہ مٹی کا ایک کونڈا بنایا۔ کوئلے دہکا کر اس کے اوپر اس کونڈے کو رکھ دیتا تھا اور اس کے چاروں طرف انگارے لگا دیتا تھا۔ جب یہ کونڈا خوب گرم ہو جاتا تھا تو اس پر جو کے آٹے کی روٹیاں سینک لیا کرتا تھا۔ اس طرح یہ روٹیاں خوب مزے دار اور سکی ہوئی پکتی تھیں۔ چاول ابالنے کے لیے ہانڈی کافی تھی۔

جب میرے پاس بہت غلہ ہونے لگا تو میں نے غلہ رکھنے کے لیے مٹی کی بڑی بڑی کوٹھیاں بنائیں تاکہ غلہ حفاظت سے رہے اور خراب نہ ہونے پائے۔

ایک بار میں نے سوچا کہ اگر میں یہاں سے نکل کر کسی قریب یا دور کے جزیرے تک پہنچ جاؤں تو ممکن ہے رہائی کی کوئی تدبیر نکل آئے۔ اس وقت مجھے وہ کشتی یاد آئی جس پر میں اور میرے بدقسمت ساتھی جہاز چھوڑ کر بیٹھے تھے اور میرے علاوہ سب ڈوب گئے تھے۔ وہ کشتی ریت میں دبی پڑی تھی۔ میں چار ہفتہ تک اس کشتی کو ریت سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ اتنی بھاری تھی کہ میں اکیلا اس کو ہلا بھی نہ سکتا تھا۔ آخر میں نے کشتی کو ہٹانے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

میں نے سوچا کیوں نہ ایک چھوٹی سی ڈونگی تیار کی جائے۔ میں جنگل میں گیا اور وہاں میں نے ایک درخت کو چنا جس کی ڈونگی تیار ہو سکے، اور بغیر یہ سوچے سمجھے کہ جب یہ ڈونگی تیار ہو جائے گی تو اسے جنگل سے سمندر تک کس طرح لے جاؤں گا، اس کے بنانے میں جٹ گیا، کیوں کہ میرے دماغ میں بس یہ دھن سما گئی تھی کہ اگر میں ڈونگی بنا لوں تو میں اس قید سے رہائی پا سکتا ہوں۔ درخت کاٹنے میں مجھے بائیس دن لگے۔ چودہ دن میں اسے پورا کیا اور ایک مہینے کی مدت میں اس کی پینیدی ناؤ کے مانند تیار کی، تین مہینے میں اسے اوپر سے نیچے تک صاف کیا۔ اب ڈونگی تیار ہو گئی۔ یہ ڈونگی خاصی بڑی تھی اور اس میں کئی آدمی بیٹھ سکتے تھے لیکن میری ساری محنت بے کار چلی گئی، کیوں کہ یہ ڈونگی جنگل سے سمندر تک نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے بہت ترکیبیں کیں لیکن کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ مجھے اپنی محنت کے برباد ہونے کا بہت قلق ہوا، آخر میں نے اس ڈونگی کو وہیں چھوڑ دیا۔

اب مجھے اس جزیرہ میں رہتے ہوئے چوتھا سال بیت گیا تھا۔ میرے پاس ضرورت کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ میں اپنے آپ کو یہاں کا راجا کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ میرے علاوہ یہاں کوئی دوسرا نہ تھا۔ میں آزاد تھا اور اپنی مرضی سے سارا کام کرتا تھا۔ میرے پاس غلہ کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں صرف اتنا ہی غلہ پیدا کرتا تھا جتنی کہ مجھے ایک سال کے لیے ضرورت ہوتی تھی۔ یہاں لکڑی کی بھی کوئی کمی نہ

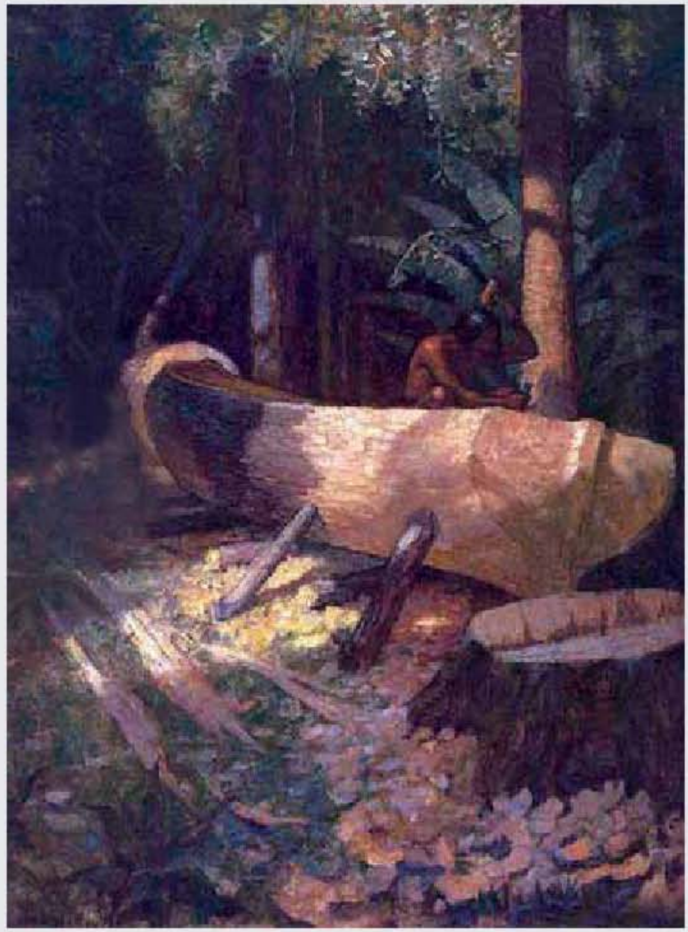

تھی، یہاں اتنی ساری لکڑی تھی کہ جہازوں کا ایک بیڑا تیار ہوسکتا تھا۔ منقیٰ اور کش مش اتنی زیادہ تھی کہ کئی جہاز لاد کر بھیجے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس سونا، چاندی اور نقدی بھی تھی لیکن یہ سارا سامان فضول تھا۔ میں صرف ایک مٹھی تمباکو پائپ اور آٹا پیسنے کی چکی کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کو تیار تھا اور گاجر و شلغم کے بیجوں کے بدلے اپنی ساری دولت دے سکتا تھا۔

مجھے اب جزیرے میں اکیلے رہتے رہتے پانچ سال پورے ہوگئے تھے۔ میری زندگی کے دن آرام سے گزر رہے تھے، سال بھر کے خرچ کا غلہ اگا لیتا تھا اور انگور سکھا کر منقیٰ بنالیا کرتا تھا۔ روزانہ بندوق لے کر شکار کو نکل جاتا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی ڈونگی بھی بنانا شروع کی۔ جب ڈونگی بن کر تیار ہوگئی تو میں نے ڈونگی کی جگہ سے تین ہاتھ چوڑی اور ڈھائی ہاتھ گہری ایک نالی کھودی اور دو فرلانگ پر جو نالہ تھا اس سے ملادیا۔ اس طرح یہ ڈونگی آسانی سے پانی تک پہنچ گئی۔ اس کام میں مجھے دو سال لگے۔ میری خواہش تھی کہ میں کسی طرح سے یہاں سے نکل کر کسی دوسرے جزیرے تک پہنچ جاؤں، شاید وہاں رہائی کی کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن یہ ڈونگی بہت چھوٹی تھی اور گہرے سمندر میں سفر نہیں کرسکتی تھی، میں نے ڈونگی میں پال لگائے اور مستول جڑے۔ ٹوٹے ہوئے جہاز سے لائے ہوئے وزنی لوہے کے ٹکڑے کا لنگر بنایا۔ ڈونگی کے پچھلے حصے میں صندوق بنائے۔ بندوق رکھنے کی جگہ بنائی تاکہ پانی سے بچی رہے۔ اب ڈونگی سفر کرنے کے قابل تھی اور میں کبھی کبھی اس پر بیٹھ کر سمندر کے کنارے کنارے گھومنے نکل جاتا تھا۔ لیکن بہت دور تک نہیں جاتا تھا۔

ایک بار میں نے ٹاپو کے چاروں طرف گھومنے کا ارادہ کیا، اور کھانے پینے کا سامان کشتی میں رکھ کر نکل پڑا۔ اس سفر میں کئی روز لگ گئے، حالانکہ یہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مشرق کی طرف ایک پہاڑ تھا۔ اس کی چٹانیں پانی میں ابھری ہوئی تھیں۔ میں نے اپنی کشتی کا رخ اس طرف کردیا۔ ایک نکلی ہوئی چٹان کے ساتھ میں نے کشتی کو باندھ دیا اور اوپر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تیز پانی کی دھار مشرق کی سمت کو بہہ رہی ہے اور قریب ہی ایک بڑا سا گرداب پانی میں پڑ رہا ہے۔ اگر میں ذرا دور اور آگے بڑھ جاتا تو میں اور میری کشتی دونوں ڈوب جاتے۔

اس وقت ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی اور سمندر کا پانی موجیں مار رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً مجھے دو دن تک اس جگہ رکنا پڑا۔ تیسرے روز

جب ہوا کم ہوگئی تو میں نے ڈونگی کھول دی اور چل پڑا۔ لیکن پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور ہوا بھی میری چھوٹی سی ڈونگی کے لیے بہت تیز تھی۔ دوسرے اس جگہ سمندر بھی گہرا تھا۔ میں باوجود کوشش کے ڈونگی کو نہ روک سکا اور ڈونگی گہرے اور کھلے سمندر میں جانکلی اور میرے قابو سے باہر ہوگئی۔ قریب ہی گہرا بھنور پڑتا تھا، مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہوا اُس وقت بھنور کی طرف نہیں چل رہی تھی اس لیے ڈونگی ادھر نہیں گئی۔ لیکن گہرے اور کھلے سمندر میں اس چھوٹی سی کشتی کے ساتھ سفر کرنا بڑا خطرناک تھا۔ کسی وقت بھی کوئی بڑی سی موج اسے الٹ سکتی تھی، اور اگر دور سمندر میں چلی جاتی تو میرا بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجانا یقینی تھا۔ میرے پاس بہت تھوڑا سا کھانا اور ایک صراحی پانی تھا۔ اگر میں سیکڑوں میل پھیلے سمندر میں بھٹک جاتا تو میرا یہ سامان کتنے دنوں تک ساتھ دے سکتا تھا۔ یہ سب سوچ سوچ کر میں گھبرا رہا تھا اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا تھا کہ میں اپنے جزیرے سے نکلا ہی کیوں تھا۔ نہ وہاں سے نکلتا نہ یہ مصیبت آتی۔

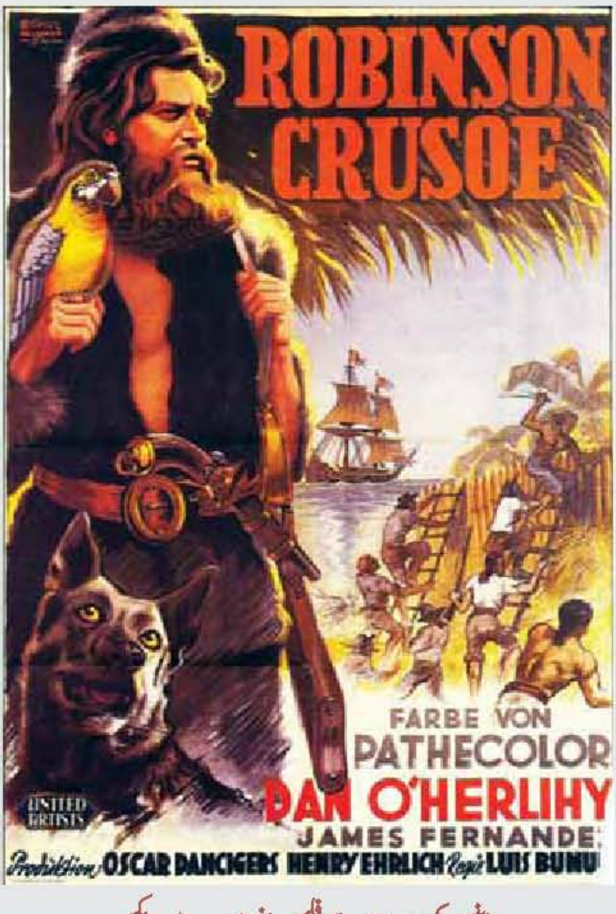

رابنسن کروسو پر بہت سی فلمیں بنی ہیں۔ یہاں دیکھیے 1954 میں میکسیکو میں بنائی گئی مشہور فلم کا ایک پوسٹر

خدا کی مہربانی سے ہوا کا رخ بدل گیا۔ میں نے پال چڑھادیے، کشتی تیزی کے ساتھ پھر کر شمال کی سمت کو ہوگئی۔ میں شام تک کنارے پر پہنچ سکا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے کشتی کو ایک محفوظ جگہ پر باندھا اور پہاڑی پر چڑھ گیا۔ مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ میرا دوسرا گھر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے جو تلاش کرنے پر مل گیا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اس لیے پڑ کر سو رہا۔ مجھے ایسا لگا کہ کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہو۔ ”کروسو! کروسو تو کہاں گیا تھا؟“

میں نے ایک دو بار آنکھیں کھولیں اور پھر سو گیا اور اس آواز کو وہم سمجھا۔ لیکن یہ میرا وہم نہ تھا۔ میرا پیارا طوطا میرے کندھے پر بیٹھا تھا اور اتنے دنوں کے بعد مجھے پا کر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے طوطے کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے غار والے گھر میں آگیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ سال بھر تک پھر سمندر میں سفر کرنے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا اور گھر کے کاموں میں مشغول رہ کر وقت گزارنے لگا۔ گو میرے پاس سارے اوزار نہ تھے لیکن تھوڑے بہت جو تھے ان کی مدد سے بڑھئی کا کام اچھی طرح کرلیتا تھا۔

میں نے کمہاروں کا ایک چاک بھی بنالیا تھا جس کی مدد سے طرح طرح کے اچھے برتن بنالیتا تھا۔ مگر جیسی خوشی مجھے ایک حقہ بنا کر ہوئی تھی، ویسی خوشی بہت ساری دوسرے چیزیں بنا کر بھی نہیں ہوئی تھی۔ حقہ کے شغل سے میرا وقت مزے کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ **جاری**

□ حشمت کمال پاشا

غزل

تھی کاہلی بھری ہوئی عبد الوہاب میں
اس واسطے وہ فیل ہوا ہے حساب میں
بچوں کو دوش مت دو بڑوں کا کمال ہے
نواب کو بدل دیا لفظِ نباب میں
دریا، ہوا، پہاڑ کی باتیں نہ تم کرو
جغرافیہ نہیں ہے ہمارے نصاب میں
اچھا ہوا کہ عیب جوئی سے تو بچ گئے
تنقید کا نہیں کوئی چیپٹر کتاب میں
امی نے جب بھی مانگا ہے بازار کا حساب
دکھلا دیا صفر انہیں ہم نے جواب میں
بوڑھوں کی طرح سوچیں گے سنجیدہ ہوکے ہم
بچپن جو یاد آئے گا عہدِ شباب میں
تم نام ان کا سوچ کے پاشا ذرا کہو
لکھتے ہیں جو کہ بچوں کی باتیں کتاب میں

Hashmat Kamal Pasha
B-119, Nawab Wajid Ali Shah Road, Post, Garden Beach, Kolkatta - 700024

□ مہدی پرتاپ گڑھی

سردی کے دو روپ

ہر چیز میسر ہے سردی میں امیروں کو
راحت نہیں ملتی ہے بے چارے غریبوں کو
کمرے میں لگا اے سی ہے مارچ دسمبر میں
مزدور لرزتا ہے اک پھوس کے چھپر میں
امرا کو میسر ہے ہر قسم کا کھانا بھی
غربا کو نہیں حاصل دو وقت کی بھی روٹی
کپڑے بھی ہیں گرم ان کے گدے بھی رضائی بھی
غربا کو نہیں ملتی اک گرم دلائی بھی
ہے گرم جو کمرہ تو سردی میں بھی راحت ہے
ہیں سرد یہاں چولہے یہ کیسی مصیبت ہے
امرا کے لیے ہر دم راحت کی ہیں سوغاتیں
کاٹے نہیں کٹتی ہیں سردی کی یہاں راتیں
عشرت میں گذرتے ہیں دن رات امیروں کے
راحت کا گذر ہوگا کب گھر میں غریبوں کے
یہ سردی کا موسم ہے امرا کے لیے راحت
بے چارے غریبوں کی خاطر ہے یہی زحمت

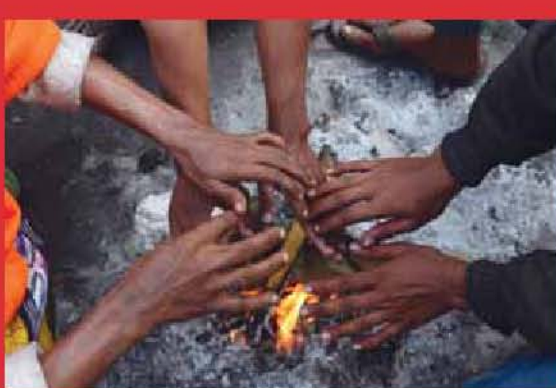

Mehdi Partap Garhi.
28- School ward, Partap Gadh-220001 UP

ادارہ

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

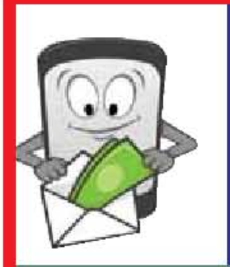

• سنتا نے گھر کا دروازہ اکھاڑا، اور اسے کندھے پر رکھ کر بازار چل دیا۔ کسی نے پوچھا، کیوں بھائی کیا دروازہ بیچنے کے لیے لے جا رہے ہو۔ جانتے ہیں سنتا نے کیا کہا؟ اس نے کہا، نہیں بھائی جی، اس کا تالا کھلوانا ہے۔ چابی کہیں گم ہو گئی ہے!

ہنسو مت۔ لطیفہ آگے ہے۔

اس آدمی نے کہا: اور اگر ایسے میں کوئی چور گھر میں گھس گیا تو؟

سنتا: اندر کیسے جائے گا؟ دروازہ تو میرے پاس ہے!

• انگریزی کا سب سے لمبا لفظ کیا ہے؟

جواب: Smiles۔ اس کے دونوں S کے درمیان ایک میل mile کا فاصلہ ہے۔ اس لیے ہر وقت مسکرایا کیجیے۔ بیٹھے بیٹھے مارننگ واک ہو جائے گی۔

• شوہر: شادی سے پہلے تمھارے کتنے بوائے فرینڈ تھے؟

بیوی خاموش رہی۔

شوہر (غصے سے): میں اس خاموشی کو کیا سمجھوں؟

بیوی: ہائے ربا، گن تو رہی ہوں۔ چلاّتے کیوں ہو؟

عبداللہ حسن، مالیگاؤں مہاراشٹر

اس طویل میسیج سے پہلے عبداللہ حسن نے جو تمہید لکھی ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ لکھتے ہیں: السلام علیکم انکل جی، پہلی ستمبر کو ہی ایس ایم ایس بھیجا تھا آپ کو نہیں ملا کیا؟ خیر پھر سے بھیج رہا ہوں۔ اب تو پسند کر لیجیے اور 'بچوں کی دنیا' میں چھپا دیجیے۔ میں نے کتنی بار ٹرائی کیا مگر آپ میرے ایس ایم ایس پسند ہی نہیں کرتے۔ لگتا ہے آپ مجھ سے خفا ہیں۔ اب پلیز بس بھی کریں۔ نظرِ کرم کریں مجھ غریب پر۔ نہیں بھئی عبداللہ حسن، آپ جیسے پیارے دوست سے بھلا ہم کیسے ناراض ہو سکتے ہیں۔

• جلی ہوئی روٹیوں پر بہت شور مچایا تم نے نادان...

ذرا ماں کی جلی ہوئی انگلیاں دیکھ لیتے تو بھوک ہی مٹ جاتی!

اختر احمد، بھساول، جلگاؤں

• ایک شخص کی بلی مر گئی۔ اس کا نوکر رونے لگا۔ مالک نے کہا: بلی میری مری ہے تو کیوں روتا ہے؟

نوکر بولا: اب میں دودھ پی جانے کا الزام کس پر لگاؤں گا؟

نام پتہ نہیں لکھا

• ''لو جی عرض کیا ہے: دنیا میں بہت درد تنہائی ہے!''

''واہ وا! واہ وا!''

''ظالمو! تم بھی تو میسیج کرو۔ میری کیا مفت کی کمائی ہے؟''

نام پتہ نہیں لکھا

• ٹیچر: 2 میں سے 2 گئے تو کیا بچا؟

عامر: سوال سمجھ میں نہیں آیا سر!

ٹیچر: تمھارے پاس دو روٹیاں تھیں۔ تم نے دونوں کھا لیں تو کیا بچا؟

عامر: سالن

سید مجید مقصود، اردھاپور ضلع ناندیڑ

• شوہر: تم سے شادی کر کے مجھے ایک فائدہ ہوا ہے؟

بیوی: وہ کیا؟

شوہر: یہی کہ مجھے اپنے سارے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں مل گئی!

• حقیقت یہ ہے کہ انسان اتنا خوب صورت نہیں ہوتا جتنا فیس بک پر ہوتا ہے، مگر اتنا بدصورت بھی نہیں جتنا آدھار کارڈ پر دکھائی دیتا ہے!

• سنتا نے خدا سے دعا مانگی: مجھے روز ایک تھیلا دے جو رقم سے بھرا ہو، ایسی جگہ نوکری دے جہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں!

خدا نے اسے لیڈیز بس کا کنڈکٹر بنادیا!

صدیقہ، ڈی ٹی ایڈ، مالیگاؤں

• جب جب گھرے بادل تیری یاد آئی

جب جھوم کے برسا پانی تیری یاد آئی

جب جب میں بھیگا تیری یاد آئی

اب رہا نہیں جاتا

اب تو چھتری لوٹا دے بھائی!

روبینہ فاطمہ، ناندیڑ

• ایک شخص مرغا خریدنے گیا۔ مرغا دیکھ کر اس نے کہا: یہ تو لنگڑ رہا ہے!

دکان دار بولا: آپ کو اسے پکا کر کھانا ہے یا اس سے ڈانس کرانا ہے؟

ایم ترنم، ناندیڑ

• میری دوستی 24 گھنٹوں والی 'اے ٹی ایم' نہیں

45 رات والی 'آل آوٹ' نہیں

لائف ٹائم والا سم کارڈ نہیں

میری دوستی 'ایل آئی سی' ہے

زندگی کے ساتھ بھی، زندگی کے بعد بھی!

نعیم احمد خاں، پرت واڑہ تعلقہ، اچل پورہ، ضلع امراؤتی

• ساس: خدا نے تجھے دو دو آنکھیں دی ہیں، چاول میں دو چار کنکر پتھر بھی نہیں نکال سکتی؟

بہو: خدا نے تمھیں 32 دانت دیے ہیں، دو چار پتھر بھی نہیں چبا سکتیں!

• ایک آپریشن کے بعد مریض:

''ڈاکٹر صاحب اب تو میں آپ لوگوں سے آزاد ہوں؟''

''بیٹا ڈاکٹر نیچے رہ گیا! میں تو موت کا فرشتہ ہوں''

نوشین خان، حبیبیہ کالونی، ناندیڑ

• ایک انگریز نے ہوٹل میں جاکر ویٹر کو آرڈر دیا: ''ٹو کپ ٹی''

ویٹر نا سمجھ تھا۔ وہ سمجھا انگریز اسے برا کہہ رہا ہے۔ جب انگریز نے آرڈر دوہرایا تو ویٹر غصے سے بولا ''تو کپٹی، تیرا باپ کپٹی تیرا پورا خاندان کپٹی!''

وسیم عبداللہ، مدینہ نگر دیگلور ناکہ ناندیڑ

• استاد: پانی کا کیمیائی نام بتاؤ

شاگرد: HIGKLMNO

استاد: میں نے کیمیائی نام پوچھا تھا انگلش حروف تہجی Alphabates نہیں پوچھے۔

شاگرد: آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ ایچ ٹو او H to O ہے۔

حسن ملک، مالیگاؤں

• مالک، کام چور نوکر سے: آج کا اخبار کہاں ہے، لے کر آؤ۔

نوکر: جناب کل سے وہی تو ڈھونڈ رہا ہوں۔ مل ہی نہیں رہا!

• ایک شخص دوسرے سے: کیا آپ انگریزی سمجھ لیتے ہیں؟

دوسرا: جی ہاں، اگر اردو میں بولی جائے تو!

امیر معاویہ، اکوٹ، ڈسٹرکٹ اکولہ

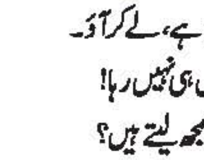

• دل سے آپ کا خیال جاتا نہیں

کوئی آپ کے سوا یاد آتا نہیں

دل چاہتا ہے صرف آپ کو ہی دیکھا کروں

مگر ہمارے ٹی وی پر کارٹون نیٹ ورک آتا نہیں!

طوبیٰ امرین، پیر برہان ناندیڑ

• ایک ٹرین پٹری سے اتر کر کھیت میں گھس گئی۔ بوکھلائے ہوئے لوگوں نے ڈرائیور سے پوچھا ٹرین کھیت میں کیسے گھس گئی؟

ڈرائیور نے کہا: پٹری پر ایک آدمی کھڑا تھا۔

لوگوں نے غصے سے کہا: تو چڑھا دیتے ٹرین اس پر بے وقوف! ایک آدمی کے لیے اتنے آدمیوں کی جان مشکل میں ڈال دی!

ڈرائیور بولا: یہی تو کر رہا تھا، مگر وہ کھیت کی طرف بھاگنے لگا!

نام پتہ نہیں لکھا

• ایک شخص شربت کا گلاس سامنے رکھ کر اداس بیٹھا تھا۔

دوست آیا، شربت پی گیا اور بولا، یار کس لیے اداس ہے؟

وہ بولا: یار آج کا تو دن ہی برا ہے۔ صبح بیوی سے جھگڑا ہوا۔ راستے میں کار خراب ہوگئی۔ دفتر لیٹ پہونچا، باس نے نوکری سے نکال دیا۔ اب خودکشی کے لیے شربت میں زہر ملایا، وہ تو نے پی لیا! اب تو ہی بتا میں کیا کروں؟

سمیہ شاذیہ، ناندیڑ

• ایک لڑکا آم کے پیڑ پر چڑھ رہا تھا۔ مالی نے دیکھ لیا اور ڈانٹ کر پوچھا، ”اوپر کیا کر رہے ہو؟“

لڑکے نے کہا، ”ایک آم نیچے گر گیا تھا اسے واپس ڈال پر رکھ رہا ہوں۔“

ثاقب جمال، مبارک پور، اعظم پور، اترپردیش

• استاد بچوں کو الجبرا پڑھا رہے تھے۔

الجبرا میں منفی وضع یعنی گھٹانے کا عمل ایک ہی طرح کی چیزوں میں کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہم چار آدمیوں میں سے تین بینگن، اور 9 کتوں میں سے 7 آدمی نہیں نکال سکتے!

ایک شاگرد: لیکن جناب، ہم 2 بھینسوں سے 4 لیٹر دودھ نکال سکتے ہیں۔

کاملہ نوری، اکولہ، مہاراشٹر

• باپ: منّا آج تمھاری امّی اتنی خاموش کیوں ہیں؟

بیٹا: صبح امّی نے ٹوتھ پیسٹ مانگا تھا...

باپ: پھر کیا ہوا؟

بیٹا (سر جھکا کر): میں نے غلطی سے فیوی کول کی ٹیوب دے دی۔

• احسن: ذکی، اگر میں ہمالیہ پہاڑ پر چڑھ جاؤں تو تم مجھے کیا دوگے؟

ذکی: دھکّا!

• ایک صاحب کو سب سے الگ انداز میں بات کرنے کا شوق تھا۔ کبھی کوئی ان سے ان کا موبائل نمبر پوچھتا تو اسے بھی وہ اس طرح بتاتے:

ساڑھے تین سو پونے پانچ سو سوا دو سوا آٹھ۔ یعنی 3504752258

محمد ظفیر الدین، حیدر باغ، ناندیڑ

• ایک اور صاحب ان سے بھی زیادہ شریر تھے۔ کوئی ان سے وقت پوچھتا تو اس طرح بتاتے کہ اچھا خاصا آدمی چکرا جائے۔ مثلاً، میں نے ایک دن خاں صاحب سے جو میاں عبدالقدوس کے نام سے بھی مشہور تھے، وقت پوچھا تو کہنے لگے سوا پانچ بج کر 25 منٹ ہوئے ہیں۔ حالانکہ آسانی سے بتا سکتے تھے کہ 6 بجنے میں 10 منٹ ہیں۔

ایک اور شخص نے 3 بج کر 25 منٹ پر وقت پوچھا تو اسے جواب دیا پونے چار بجنے میں 20 منٹ باقی ہیں۔ وہ شخص لاحول پڑھ کر خود ہی بھاگ گیا۔ آخر چھٹی کلاس کے ایک بچے نے جو حساب میں تیز تھا خاں صاحب کو سبق سکھایا۔ ایک دن ان کے پاس آکر بولا، جانتے ہیں خاں صاحب انکل اس وقت کیا وقت ہوا ہے۔ ”کیا!؟“ وہ بے ساختہ کہہ بیٹھے۔ بچے نے کہا، اس وقت وہ وقت ہے کہ 22 منٹ بعد 12 بجنے میں 17 منٹ رہ جائیں گے۔ تب جا کر خاں صاحب چکرائے!

اعزازی مدیر، فروغ اردو بھون، جسولہ، نئی دہلی

• ایک دن بندر بولا: ماں میری شادی کرادو۔ میری دلہن کون بنے گی؟

ماں نے کہا: دیکھ تیری دلہن یہ ایس ایم ایس پڑھ رہی ہے۔ اگر پڑھ کر مسکرائے تو رشتہ پکّا...

• ناراض نہ ہونا۔ تم واقعی پاگل ہو۔ ثبوت دوں؟ پ یعنی پیارے ہو۔ الف یعنی اچھے۔ گ یعنی گریٹ۔ ل یعنی لاجواب! تو ہوئے نا پاگل!

کامران مستقیم، دیوان پورہ منگرول پیر، ضلع واشم

• منّا فوٹو البم دیکھتے ہوئے: ممی یہ آپ کے ساتھ اسمارٹ سے انکل کون کھڑے ہیں؟

ممی: یہ تمھارے ابّو ہیں بیٹے

منّا: تو پھر ہم ایک گنجے سے انکل کے ساتھ کیوں رہتے ہیں؟

فراز احمد، دیول گھاٹ، بلڈھانا، مہاراشٹر

• گاہک: یار ویٹر ایسی چائے پلاؤ جسے پی کر تن من جھوم اٹھے اور دل ناچنے لگے!

ویٹر: جناب ہمارے یہاں بھینس کے دودھ کی چائے ملتی ہے ناگن کے دودھ کی نہیں!

محمد فوزان انصاری، بھیونڈی

• میری نظم:

زندگی بڑی اداس ہے

ڈاگ کو لگی پیاس ہے

مجھے دنیا سے کوئی نہ آس ہے

گائے کھاتی گھاس ہے

موبائل ٹوٹ جائے اس کا

جو کہے یہ نظم بکواس ہے

• ہونٹ جیسے سیم کی پھلی

گال جیسے لال ٹماٹر

آنکھ جیسے مٹر کے دانے

چہرہ جیسے ابلا ہوا آلو

یا اللہ اتنا پیارا دوست، لگتا ہے سبزی کی دکان!

شجل نمرہ، مالیگاؤں

• استاد: دیکھو بیتا گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ہے!

شاگرد: مگر جناب ہمارے اسکول آنے کا وقت تو ہر روز ٹھیک بارہ بجے واپس آجاتا ہے!

رومانہ نازنین، ناندیڑ

• بریکنگ نیوز: اب 50 کے ری چارج پر 9999 روپے کا ٹاک ٹائم ۔ 80 سال کی ویلیڈیٹی validity ۔ تمام کالز: 0.01 پیسے/گھنٹہ hrs

5 لاکھ ایس ایم ایس فری ۔ وزٹ visit کریں:

www.ja_tu_apna_alag_tower_laga_le.com

اس مہینے کا ایس ایم ایس

• ایک بیڈ پر تین پاگل سو رہے تھے۔ تینوں کو جگہ کم پڑ رہی تھی

ایک اٹھ کر بیڈ کے نیچے سو گیا

بیڈ سے ایک پاگل بولا: واپس آجا۔ اب جگہ ہو گئی ہے

مسفرہ تحریم، پتہ نہیں لکھا

• گبّر: یہ موبائل ہم کو دیدے ٹھاکر

ٹھاکر: دیکھ یار ہاتھ پیر تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن موبائل کی مذاق نہیں۔ ویسے بھی فیس بک چالو ہے اور بسنتی آن لائن ہے!

جنید خلیل احمد، ملّت نگر، دھولے

• لڑکی: تم لڑکے سب ایک جیسے کیوں ہوتے ہو؟

لڑکا: Actually، ہم میک اپ نہیں کرتے۔

• شوہر کھانا کھاتے ہوئے: اپنے چہرے سے زلفیں ہٹالو!

بیوی شرما گئی

شوہر بولا: شرمانے کی بات نہیں ہے۔ اگلی بار اگر کھانے میں بال آیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا!

عرفات انصاری، بھیونڈی

• انصب اور ارسلہ نے، جگہ کا نام نہ دیتے ہوئے علامہ اقبال کی نظم طالب علم کی دعا کی پیروڈی 'طالب فلم کی دعا' شائع کرنے پر اعتراض کیا ہے۔ انھیں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ پیروڈی باقاعدہ اردو شاعری کی ایک پسندیدہ صنفِ سخن' یعنی شعر میں بات کہنے کا طریقہ ہے جس میں غلط راہ اپنانے والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس پیروڈی میں بھی ان بچوں کا مذاق اڑایا گیا تھا جو ہر وقت فلموں کے چکّر میں پڑے رہتے ہیں۔ دلاور فگار اور راجہ مہدی علی خاں جیسے اردو کے بڑے ادیبوں نے بھی اس مشہور دعا کی پیروڈیاں لکھی ہیں۔ اور ہاں، پیروڈی ہمیشہ کسی مشہور ادبی تخلیق کی ہی لکھی جاتی ہے۔ آفتاب احمد سراج خان کی شکایت ہے کہ ان کے ایس ایم ایس شائع نہیں کیے جاتے۔ آفتاب میاں آپ چھاپنے کے لائق ایس ایم ایس بھیجیں گے تو ہم ضرور شائع کریں گے۔ دیگلور سے شاہجہاں انجم نے ایک مسیج بھیج کر کہا ہے تین بار بھیجنے پر بھی ہم نے اسے شائع نہیں کیا۔ ان سے کہنا ہے کہ کیا آپ کے پاس کوئی دوسرا مسیج نہیں؟

ایس ایم ایس صرف اس فون نمبر پر کریں 9540165653

بڑوں کی باتیں

ادارہ

گیارہ محرم کو فجر کی نماز پڑھنے کے تھوڑی دیر بعد مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے کوئی صاحب بڑے دل گداز ترنم سے سلام پڑھنے لگے:

سلطان کربلا کو ہمارا سلام ہو
جانانِ مصطفیٰ کو ہمارا سلام ہو

معذوری کی وجہ سے گھر پر ہی نماز پڑھتا ہوں۔اس وقت پلنگ پر لیٹا تھا۔ سلام سننے کے بعد یہ سوچ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اسلامی تہذیب کی نشر واشاعت میں بھی 'بچوں کی دنیا' لوگوں کے کام آرہا ہے (نومبر کے شمارے میں یہ سلام شائع ہوا تھا) 'بچوں کی دنیا' کی پذیرائی کا یہ انوکھا انداز مجھے پسند آیا جس کی ابتدا شہر مالیگاؤں سے ہوئی ہے۔اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تعلیمی جلسوں، جشن سال گرہ اور دیگر تقریبات میں 'بچوں کی دنیا' کی نظمیں پڑھی جاسکتی ہیں۔مگر اس میں انعامی مقابلوں کی کمی محسوس کر رہا ہوں۔مجھے آج بھی یاد ہے کہ 'کھلونا' میں کارٹونی تصویر پر مجھے انعام ملا تھا۔ رِنگ میں دو باکسر کھڑے تھے۔ ریفری ان سے کہہ رہا تھا "ایک دوسرے کے دانت توڑنے کی کوشش کیجیے کیونکہ یہاں صرف دانتوں کا ڈاکٹر موجود ہے۔" مجھے چار کتابیں انعام میں ملی تھیں۔یہ کتابیں پاکر اتنی خوشی ہوئی کہ عید پر بھی نہیں ہوئی تھی۔ 'بچوں کی دنیا' میری نظر میں یہ ایک ایسا استاد کامل ہے جو ہر رہ گزر پر شمع روشن کرتا ہے۔میری عمر 82 سال ہوچکی ہے آج بھی میں علم وادب کا کھلونا کھیلنے والا بچہ ہوں۔وہی امنگ وہی انتظار آج بھی 'بچوں کی دنیا' کا رہتا ہے جو کبھی کھلونا کا رہا کرتا تھا۔میں 'بچوں کی دنیا' کا بوڑھا بچہ، 64 سال سے بچوں کے لیے مسلسل لکھ رہا ہوں، مگر قلم ہے کہ چھوٹتا نہیں۔میری صحت کے لیے دعا فرمایئے!

محمد یوسف انصاری، 368 نیو وارڈ، مالیگاؤں، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' کا نومبر کا شمارہ نظر سے گزرا۔ بہت پسند آیا۔'بچوں کی دنیا' کو ہم بڑوں کی دنیا بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے مضامین سے بڑے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے بچوں کے رسائل میں میرے خیال سے یہ رسالہ انفرادیت رکھتا ہے۔اس کی خوبصورتی اور اس کا معیار واقعی بہت بلند ہے۔اتنا عمدہ رسالہ پیش کرنے پر میری مبارکباد قبول فرمائیں۔

محسن باعشن حسرت، کولکاتا، مغربی بنگال

'بچوں کی دنیا' کے ذریعے نئی نسل جس طرح تربیت پا رہی ہے اس کا خاطر خواہ اثر سماج پر پڑے گا۔کونسل کی یہ خدمت نہ صرف اردو کی دنیا کو نئی روشنی سے روشناس کرا رہی ہے بلکہ بچوں کو نئی راہوں پر چلنے کی بھی دعوت دے رہی ہے۔

مہدی پرتاب گڑھی، 128، اسکول وارڈ، پرتاب گڑھ، اتر پردیش

آپ کا رسالہ 'بچوں کی دنیا' دنیائے اطفال میں ہنگامے برپا کر رہا ہے اور معیار کی بلندیاں چھو رہا ہے۔میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں اعلیٰ کارکردگی کا ستائشی لہجے میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس میں بار بار شائع ہونے کی للک پیدا ہوتی ہے۔

نثار ٹونکی، کالی پلٹن روڈ پلی محمد خان ٹونک راجستھان

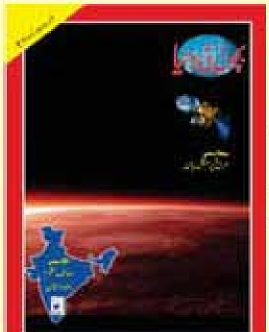

'بچوں کی دنیا' بڑے غضب کا رسالہ ہے۔ مطالعے کے دوران کچھ دیر کے لیے بالکل بھی احساس نہیں رہا کہ میں بوڑھا ہوں۔دل بھی مسکرا رہا تھا، ذہن میں شوخیاں بھی رقص کر رہی تھیں، یہ بات الگ کہ شوخی اتنی دیر کی تھی جتنی دیر شفق آسمان پر رہتی ہے۔ خوب صورت دیدہ زیب سرورق، مزے مزے کی حکایتیں، بھولے بھالوں کی حماقتیں، پیاری پیاری سبق آموز شفقت ظرافت خدمت اور محبت سے بھری بچوں کی زبان میں لکھی گئی کہانیاں۔ پڑھتے وقت یوں لگا جیسے ہم ابھی بچے ہیں۔ یہ رسالہ بچوں بڑوں اور بوڑھوں کے لیے ٹانک ہے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں نا... "ہر ٹانک ہر ایک کو پسند نہیں آتا"

خالد ہادی ملیگ، بذریہ مست خاں، رامپور، اتر پردیش

ادارہ

بچّوں کا اخبار

ایبولا اس سال ختم ہو جائے گا

نیویارک: دنیا بھر کے ملکوں کی تنظیم United Nations یعنی اقوام متحدہ سے بڑی اچھی خبر یہ آئی ہے کہ اس سال یعنی 2015 میں ایبولا کے خطرناک مرض کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اقوام متحدہ کے ایبولا مشن کے ریٹائرڈ سربراہ انتھونی بینبر کا کہنا ہے کہ 'اس سال کے آخر تک ایبولا کے کیسز کی کی تعداد صفر ہو جائے گی،' مگر انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس مہلک مرض کو قابو میں لانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑے گی۔ اس وائرس سے اب تک تقریباً آٹھ ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت یعنی ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن یا WHO کے مطابق لائبیریا، سیرا لیون اور گنی میں ایبولا وائرس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد 20000 سے تجاوز کر گئی ہے اور سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک گنی ہے۔ دراصل ایبولا وائرس بلغم تھوک اور منھ کے پانی کے ذریعے دوسرے لوگوں تک پھیل سکتا ہے۔ اس سے ابتدا میں زکام جیسی علامات ظاہر ہوتی ہیں اور بعد میں آنکھوں اور مسوڑھوں سے خون رسنا شروع ہو جاتا ہے۔ جسم کے اندر خون جاری ہو جانے سے اعضا متاثر ہوتے ہیں۔ وائرس سے متاثرہ 90 فیصد لوگ مر جاتے ہیں۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جان لیوا ایبولا وائرس کی شروعات گنی کے دو سال کے بچے امیل اومونو کے اس کھوکھلے درخت میں کھیلنے سے ہوئی جہاں بہت سی چمگادڑوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ انھوں نے بچے کے گاؤں میلینڈو میں لوگوں سے ایبولا کی وجوہات جاننے کے لیے بات کی اور وہاں سے نمونے بھی اکٹھے کیے۔ میلینڈو 31 گھرانوں کا ایک گاؤں ہے جو گنی کے گھنے جنگلات سے گھرا ہے۔ اس گاؤں میں بڑی تعداد میں چمگادڑ موجود ہیں اور سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ایبولا وائرس ان ہی چمگادڑوں سے دو سالہ امیل اومونو کو منتقل ہوا جو ایک درخت کے تنے میں رہتی تھیں۔ یہ کھوکھلا درخت امیل کے گھر سے صرف 50 میٹر کے فاصلے پر موجود تھا۔ امیل اور دوسرے بچے اسی کھوکھلے درخت میں کھیلتے تھے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ رواں سال مارچ میں جب اس درخت کو آگ لگی تو چمگادڑوں کی بارش برس رہی تھی۔ بغیر دم کے بہت سارے چمگادڑوں کو گاؤں کے باسیوں نے کھانے کے لیے جمع کر لیا تھا لیکن حکومت نے اگلے دن ان چمگادڑوں کا گوشت کھانے پر پابندی عائد کر دی جس کے بعد مرے ہوئے چمگادڑ پھینک دیے گئے۔ یہ چمگادڑ ایسے کیڑے مکوڑوں اور مچھروں کو کھا جاتے ہیں جن سے ملیریا پھیلتا ہے۔

مریخ پر موجود کمپیوٹر کو ہیک کیا جائے گا

واشنگٹن: دس سال سے سیارہ مریخ کا مشاہدہ کرنے والے خلائی روبوٹ اوپر چیونٹی Opportunity کو کچھ تکنیکی مسئلوں کا سامنا ہے جنھیں ناسا کے ماہرین اب 'ہیک' Hack کر کے ٹھیک کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ اوپر چیونٹی کی دیکھ بھال کرنے والی ٹیم کا خیال ہے کہ مسئلہ روبوٹ کی فلیش میموری کے ساتھ ہے۔ ناسا کا خیال ہے

مصنوعی ذہانت انسان کو ختم کر دے گی

دنیا بھر میں مشہور سائنس کے پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ نے مصنوعی ذہانت کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ مکمل مصنوعی ذہانت Artificial Inteligence کی ترقی انسانی نسل کا خاتمہ کر دے گی۔ وہ کہتے ہیں ایک دفعہ انسانوں نے اسے بنالیا تو اس کے ارتقا کا عمل خود ہی آگے بڑھتا رہے گا اور انسان اپنے سست رفتار حیاتیاتی ارتقا کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ کیلی فورنیا کے مشہور سلیکن ویلی میں بڑے ہونے والے سرمایہ کار اور مصنف مائیکل ایس ملون کے مطابق مشینیں انسانوں سے زیادہ دیر زندہ رہ سکتی ہیں۔ بی بی سی سے بات کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ ہر زندہ انسان کا دل اس کی پوری زندگی میں تقریباً ایک ارب دفعہ دھڑکتا ہے اور دوسری جانب ایک جدید مائیکرو پروسیسر ہر سیکنڈ میں پانچ سے دس ارب کا حساب کر لیتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں بنیادی طور پر یہ آلات لازوال ہیں اور ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم مشینوں سے ابدی زندگی کا راز حاصل کر سکتے ہیں؟ ▫

کہ اسے خلائی گاڑی روور Rover کے سافٹ ویئر کو ہیک کرنے کا طریقہ مل گیا ہے، جس کی مدد سے وہ نقص کو ٹھیک کر سکیں گے۔ ناسا کا کہنا ہے کہ خرابی دن بہ دن بڑھ رہی ہے اور کئی بار تو زمین سے اس کا رابطہ بھی ٹوٹا ہے۔ مسئلے کو حل کرنے کے لیے ناسا کی ٹیم روور کے سافٹ ویئر کو ہیک کرے گی ▫

خلا میں 16 بار نئے سال کا جشن

واشنگٹن: امریکی خلائی ایجنسی ناسا NASA کے مطابق بین الاقوامی خلائی اسٹیشن International Space Station پر سوار 42 خلائی مسافروں نے اس مرتبہ 31 دسمبر اور پہلی جنوری کی درمیانی کی رات 16 مرتبہ نیا سال منایا۔ وجہ؟ یہ خلائی اسٹیشن 28,163 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کے 16 چکر لگاتا ہے۔ اس پر خلائی سائنس داں خلا میں سفر کے دوران طویل عرصے میں انسان پر ہونے والے اثرات کا معائنہ کر رہے ہیں۔ خلائی اسٹیشن میں چیونٹیوں کی کالونی بھی بنائی گئی ہے اور سائنسداں خلا میں چیونٹیوں کے برتاؤ کا مشاہدہ کر رہے ہیں جس سے مستقبل میں چھوٹے روبوٹ بنانے میں مدد ملے گی۔ ▫

132 سال بعد لڑکی پیدا ہوئی

لندن: انگلینڈ کے لنکاشائر میں ایک پرانا خاندان ایسا ہے جس میں شادیاں تو بہت سی ہوئیں لیکن 132 سال سے کوئی لڑکی خاندان میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اب جا کر خاندان میں ایک لڑکی کا جنم ہوا ہے جس کا نام ہے انابل روز۔ اس خاندان میں پانچ پشت پہلے 1882 میں آخری لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ انابل کے والدین لیورنگ اور ڈیبورا خوش ہیں کہ انھوں نے خاندان کا اتنا پرانا ریکارڈ توڑ دیا۔ ▫

خبریں: بشکریہ: بی بی سی اردو، نو بھارت ٹائمز

ادارہ

ذہانت بھرے سوال جواب

ڈاکٹر اقبال اردو ماڈل ہائی اسکول اردھا پور کی نویں جماعت میں پڑھنے والی عائشہ صدیقہ نے ذہانت سے بھرے چند دل چسپ سوال اور ان کے جواب لکھ بھیجے ہیں۔ انھیں پڑھیے اور عایشہ کی ذہانت کی داد دیجیے:

سوال: وہ کیا ہے جس کے بغیر عام طور پر نماز نہیں ہوتی اور جس کے حروف الٹ دیں تب بھی نہیں الٹتا

جواب: وضو

سوال: دوسروں کی بیماری سے کون خوش ہوتا ہے؟

جواب: ڈاکٹر

سوال: روز کے استعمال کی وہ چیز کیا ہے جس کے دانت ہوتے ہیں مگر کھانے کے نہیں

جواب: کنگھا

سوال: کس انگریزی مہینے میں عورتیں کم بولتی ہیں؟

جواب: فروری! اس کے دن کم ہوتے ہیں!

سوال: کس انسان کے سامنے بہادر سے بہادر شخص سر جھکا دیتا ہے

جواب: حجام

سوال: محنت لکھنا ہے تو پہلے کیا لکھو گے؟

جواب: م

سوال: مرغ کو کون مرغی بنا سکتا ہے؟

جواب: ی

گاجر کی شادی

وجیہہ ارم کی نیرپرسوپنت ضلع ایوت مال سے بھیجی ہوئی اس نظم کے سب مصرعے شاعری کے وزن میں نہیں ہیں پھر بھی نظم ہے دل چسپ۔ ہم نے تھوڑی سی مرمت کی ہے:

چھوٹی سی گاجر چلی اپنی سسرال
کپڑے ہیں پہنے ہوئے لال لال

شلجم چچا ہے مولی ہے خالہ
آلو ہے اس کے بھائی کا سالہ
بھائی ٹماٹر بھنڈی ممانی
ٹیڑھی کمر کی لوکی ہے نانی
رو رو کے سب کا ہوا ہے برا حال
چھوٹی سی گاجر چلی اپنی سسرال

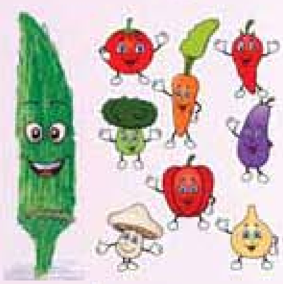

کالا کلوٹا بینگن ہے دولہا
جیسے ہمیشہ جھونکا ہو چولہا
مرچی کا چہرہ بھی رو کر ہوا لال
چھوٹی سی گاجر چلی سسرال

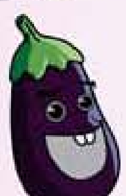

شرارت کا انجام

ضلع پربھنی اردو اسکول سبھاش نگر بھماڑی کی آٹھویں جماعت کی بشریٰ شیخ ذاکر نے دہلی کے چڑیا گھر میں سفید شیر کی ویڈیو بناتے وقت ایک نوجوان کی لرزہ خیز موت کے واقعے کو کہانی بنا کر بھیجا ہے، جس کا عنوان ہے 'شرارت کا انجام'۔ بشریٰ سے ہم کہنا چاہیں گے کہ ابھی آپ اسی طرح لکھتی رہیے، جب کوئی کہانی 'بچوں کی دنیا' کے لائق ہو جائے گی تو ہم ضرور چھاپیں گے۔ اعزازی مدیر

لبیبہ غفران احمد

الاقصیٰ شکیل شیخ

بشریٰ سلیم شیخ

ازکی آصف

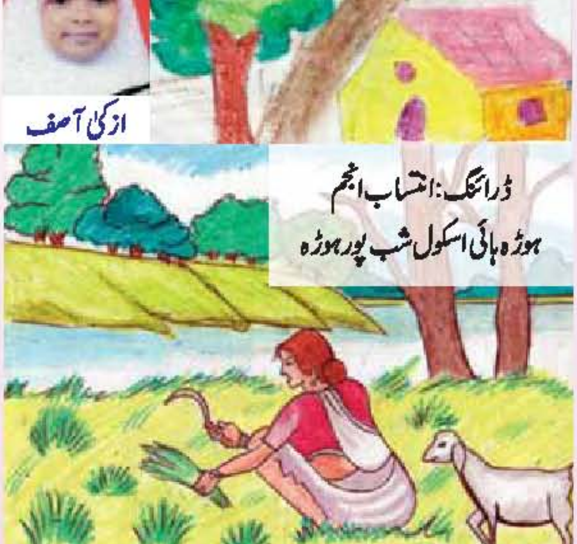

ڈرائنگ: انتساب انجم
ہوڑہ ہائی اسکول شب پور ہوڑہ

ڈرائنگ: مرزا عاطف بیگ، تصویر اردو فیس بک پر

گزارش: تخلیقات کے ساتھ اپنی تصویر ای میل سے بھیجیں تو اپنا نام
اور اسکول کا پتہ تصویر کے ساتھ یا ڈرائنگ پر ضرور لکھ دیں

□ ادارہ

اردو Facebook

□ انکل ! نیا سال مبارک۔ میں اردو اور عربی اچھی طرح پڑھ اور لکھ لیتی ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' کا گھر میں سبھی کو انتظار رہتا ہے۔ ایک لطیفہ سن لیجیے۔ ایک خان صاحب جو کافی غصے والے تھے، اتنے غریب ہوگئے کہ فاقوں کی نوبت آگئی۔ ایک دن مجبور ہو کر بھیک مانگنے نکلے۔ مگر کچھ دور جا کر ہی پلٹے اور بیوی سے کہا ذرا کھونٹی پر سے تلوار اتار دو۔ بیوی نے پوچھا: بھیک مانگنے نکلے ہو تو تلوار باندھ کر کیا کرو گے؟ خان صاحب بولے: اگر کسی سے حجت ہوگئی تو کیا تلوار لینے گھر آؤں گا؟

اقبال انجم، ساتویں جماعت، آئی ٹی آئی ہائی اسکول اڈگل۔ کرناٹک

□ ٹیپو سلطان کا اصلی نام فتح علی تھا۔ مینڈک کے جسم میں ہڈی نہیں ہوتی۔ گھوڑا بھی انسان کی طرح خواب دیکھتا ہے۔ فاختا کی آواز سے سانپ بھاگ جاتا ہے۔

مرزا عاطف بیگ، جلگاؤں جامود، مہاراشٹر

ٹیپو سلطان کی حد تک تو آپ کی بات ٹھیک ہے۔ لیکن مینڈک کو چیر پھاڑ کر دیکھیں گے تو اس کے جسم میں کئی ہڈیاں ملیں گی۔ خاص طور سے سر کی ہڈی جو خاصی مضبوط ہوتی۔ خواب والی بات آپ نے کسی گھوڑے سے پوچھ کر لکھی ہے یا یوں ہی نقل ماری ہے۔ سچ یہ ہے کہ گھوڑا ہی نہیں بہت سے اور جانور بھی خواب دیکھتے ہیں۔ رہ گئی سانپ والی بات تو مرزا صاحب سانپ کے تو کان ہی نہیں ہوتے۔ پھر وہ فاختہ کی بات کیسے سنے گا بھلا۔ دراصل وہ آوازوں کو زمین کی لرزش سے اپنی ہڈیوں کے ذریعے محسوس کر پاتا ہے۔ **اعزازی مدیر**

□ انکل! میرا نام عافیہ عارفی ہے۔ میری عمر تین سال ہے۔ مجھے ابھی پڑھنا لکھنا ٹھیک سے نہیں آتا۔ لیکن آپ کے میگزین کی تصویریں دیکھنا

بہت اچھا لگتا ہے۔ میں جلدی جلدی اردو پڑھنا سیکھ رہی ہوں تاکہ میں خود ہی میگزین کی کہانیاں پڑھ سکوں۔ اتنا خوبصورت رسالے نکالنے کا بہت بہت شکریہ۔

عافیہ عارفی لہیر یا سرائے، دربھنگہ، بہار

□ اس سال میرے ابو، امی اور دادی جان حج کے لیے گئے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ ہم بھائی بہن والدین سے اتنے دن دور رہیں۔ ممبئی ایئر پورٹ پر ہم خوشی خوشی انھیں روانہ کرنے گئے مگر اصل امتحان تب شروع ہوا جب گھر واپس آئے۔ دن ہو یا رات۔ صبح کا ناشتہ ہو، دوپہر کا کھانا ہو یا رات کا کھانا کپڑوں کی صفائی ہو یا اسکول کی تیاری، ہر وقت دادی، امی اور ابو کا پیار، ان کی شفقت اور کبھی کبھی ڈانٹ پھٹکار سب کچھ بہت یاد آتا تھا اور آنسو جاری ہو جاتے۔ واقعی والدین اللہ کی نعمت ہیں۔

شمائلہ صدف کلاس 4، ذیشان اسد کلاس 2 اقرا اردو پرائمری اسکول جلگاؤں

□ میں طوبیٰ ارشد، مدرسہ جامعہ امام ابن تیمیہ میں آٹھویں درجہ کی طالبہ ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' جب آتا ہے تو سب چھوڑ چھاڑ کے اسے ایک سرے سے پڑھ جاتی ہوں۔ فسانہ عجائب میرا پسندیدہ سلسلہ تھا۔ ہندی میں بچوں کے میگزین پڑھتی تو سوچتی کہ اردو میں ایسا عمدہ اور خوبصورت میگزین کیوں نہیں چھپتا۔ آپ نے یہ کمی پوری کردی۔

طوبیٰ ارشد، چندن بارہ، مشرقی چمپارن، بہار

□ 'بچوں کی دنیا' پڑھ کر لگتا ہے جیسے کوئی نیا ساتھی مل گیا ہے جو ہماری بات سنتا ہے اور معلومات کا ذخیرہ دیتا ہے۔ اس کے لیے ہم سبھی بچے آپ کے شکرگزار ہیں۔

عفیفہ، راجیو گاندھی اردو ہائی اسکول، ہنگولی روڈ ہنگولی، مہاراشٹر

انوکھے منظر! انٹرنیٹ سے

ادارہ

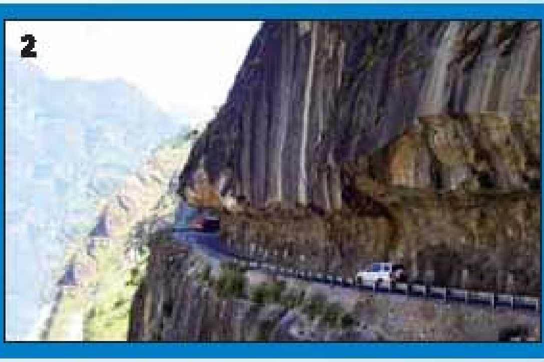

1-اس شمارے کی خاص تصویر، ہماچل پردیش میں راستے کا ایک خطرناک موڑ 2-ہماچل پردیش کا ہی ایک اور خطرناک راستہ جو چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے 3-تیز رفتار کا انجام 4-اسے کہتے ہیں ٹریفک جام 5-فلائی اوروں کا جال۔ بلکہ جنجال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

صفحات: 62، قیمت: 14 روپے

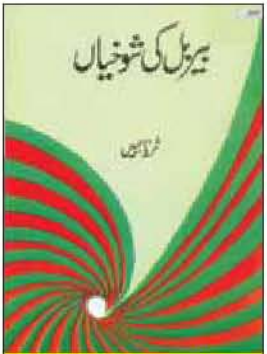

صفحات: 64، قیمت: 12 روپے

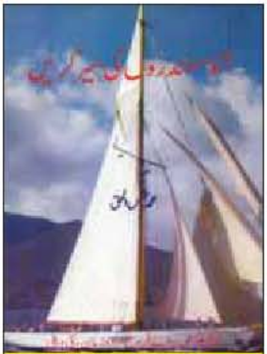

صفحات: 183، قیمت: 20 روپے

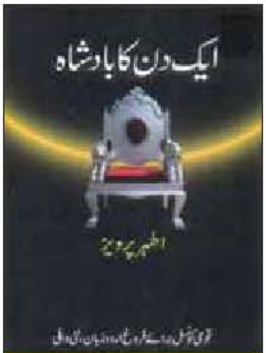

صفحات: 151، قیمت: 20 روپے

صفحات: 58، قیمت: 12 روپے

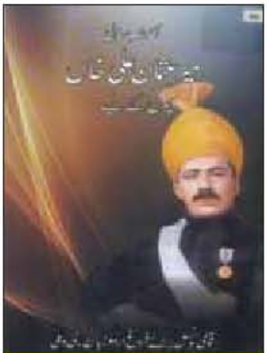

صفحات: 56، قیمت: 12 روپے

صفحات: 52، قیمت: 14 روپے

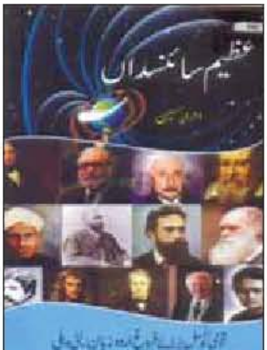

صفحات: 83، قیمت: 15 روپے

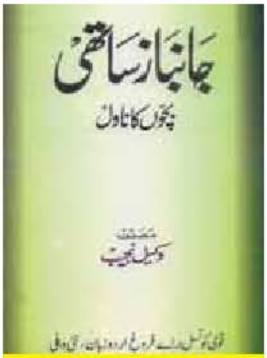

صفحات: 200، قیمت: 42 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, February 2015, Vol. 03, Issue: 2
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL (S) - 01/3439-2013-15
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/1/15
Date of Dispatch : 12 and 13 of Advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

صفحات:48، قیمت:15 روپے

صفحات:102، قیمت:16 روپے

صفحات:79، قیمت:14 روپے

صفحات:183، قیمت:23 روپے

صفحات:87، قیمت:21 روپے

صفحات:78، قیمت:18 روپے

صفحات:128، قیمت:29 روپے

صفحات:136، قیمت:20 روپے

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000